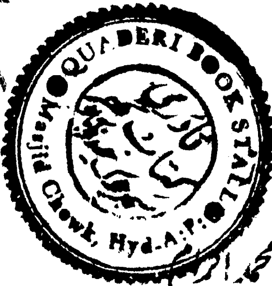
شبلی نامہ

ایک فن کار کی داستانِ حیات



شیخ محمد اکرام

ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ آر ۔ سی ۔ اے ۔ یس (آئی ۔ سی ۔ ایس)



جدید سیرت نگاری

سیرت نگاری کی نسبت علامہ شبلی مرحوم کا نقطۂ نظر عام مشرقی تذکرہ نویسوں کے زاویۂ نگاہ سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی رائے تھی کہ سیرت نگار کو صاحب سیرت کی زندگی کا ہر پہلو دکھانا چاہیئے۔ سیاہ بھی اور سفید بھی۔ روشن بھی اور تاریک بھی۔ وہ ان لوگوں کے مخالف تھے۔ جو کسی کے "معائب دکھانے کو تنگ خیالی اور ذلیلتی" سمجھتے ہیں اور کہتے تھے کہ "اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں، سب برباد ہو جائیں"۔

شبلی تذکرہ نویسی کے متعلق اپنے نظریئے کو فقط عام دنیاداروں تک محدود نہ رکھتے تھے۔ بلکہ ان کا تو خیال تھا کہ صحابۂ کرام کی زندگیاں بیان کرتے وقت بھی اس اصول پر عمل کیا جائے۔ وہ نواب مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو، جو صحابہ کے حالات میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

> صحابہ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ لیکن ہر پہلو کو لیجئے۔ اور ان پہلوؤں کو صاف دکھلایئے۔ جن سے آج کل کے مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں۔

شبلی بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ جس قسم کی سوانح نگاری کے وہ خلاف تھے اس کا سب سے بڑا ادارۂ اشاعت ان کا اپنا دارالمصنفین ہوگا۔ اور اس کا سبب

نمایاں نمونہ ان کی اپنی سوانح عمری، حیاتِ شبلی ہیں ملے گا!!

اگر تذکرہ نویسی کے متعلق شبلی کا نقطۂ نظر بڑی حد تک انگریزی ادیب کارلائل سے ماخوذ تھا جو یہ کہتا تھا کہ ایسی سوانح عمریاں لکھنے سے، حقیقت کو آئینہ نہیں دکھاتیں، بہتر ہے کہ سوانح عمریاں سرے سے لکھی جائیں۔ لیکن کارلائل کے بعد مغرب میں دو نئے اثرات کارفرما ہوئے ہیں جنھوں نے سوانح نگاری کے پرانے تخیل کو یکسر بدل دیا ہے۔ ان اثرات میں سے ایک تو جدید علم نفسیات کی نشو و نما ہے۔ جس کی وجہ انسانی ذہن کی نیرنگیوں اور افراد کی باطنی کشمکش میں ارباب علم کی د... بہت بڑھ گئی ہے۔ بائیوگرافی اب فقط سوانح نویسی نہیں رہی بلکہ سیر... ہو گئی ہے۔ اور تذکرہ نویس کا کام فقط صاحبِ تذکرہ کے ظاہری کار... گننا نہیں۔ بلکہ اس کی شخصیت کو بے نقاب کرنا اور اس کی نفسیاتی س... کی ایک روشن اور واضح تصویر کھینچنا ہے۔

بائیوگرافی میں اس انقلاب کا دوسرا سبب انگریزی سیرت نگار لٹن اسٹر... کی مثال اور تحریریں ہیں۔ اس نے ان بھاری بھرکم "مفصل اور مستند" سوانح عمریوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ جن میں بغیر کسی انتخاب اور کسی ... تخیل (ہلین) کے، صاحبِ تذکرہ کے متعلق واقعات کا ایک ایسا انبار... کر دیا جاتا ہے۔ جس سے نہ تو پڑھنے والے کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور ... ہی صاحبِ تذکرہ کی شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں لیٹن اسٹر... نے سیرت نگاری کو ایک ہلکی پھلکی چیز بنا دیا ہے جس میں افسانے... دلچسپی اور عالمِ نفسیات کی ژرف بینی آگئی ہے۔ تذکرہ نگار اب بھی صاحب... کی نسبت واقعات و معلومات کا ذخیرہ جمع کرتا ہے۔ بلکہ طلب کا دامن

سے بھی زیادہ دور پھیلا تا ہے۔ لیکن تمام واقعات کا احاطہ کرنے کے بعد وہ دریا کو کوزے میں نہیں، ایک ایسے جامِ بلوریں میں پیش کرتا ہے جس کے اندر سے صاحبِ تذکرہ کی شخصیت صاف جھلکتی ہے۔

جیسا کہ حالی نے اردو کی پہلی سوانح عمری حیاتِ سعدی کے شروع میں لکھا ہے۔ اردو میں جدید سوانح نگاری، انگریزی ادب کے راستے سے آئی لیکن ہمارا لٹریچر انگریزی سوانح نگاری کے تازہ ترین اثرات سے بالکل محروم رہا ہے۔ ہمارے تذکروں میں حالی کی حیاتِ جاوید کو "برتر سے برتر سوانح عمری" کہا جاتا ہے۔ لیکن حیاتِ جاوید کی بڑی ٹھوس خوبیوں کے باوجود، ہمارے خیال میں، یہ کہنا مشکل ہے کہ حالی نے سرسید کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی کتاب سرسید کے کارناموں کی تفصیل اور ان کے ایک مفصل مگر سطحی تجزیے پر مشتمل ہے۔ مفصل۔ مدلل۔ متوازن۔ منصفانہ لیکن یادگارِ غالب کی طرح ایک فنی شاہکار نہیں۔ اس سے سرسید کے متعلق تمام واقعات جاننے کے بعد بھی ان کی ایک روشن اور واضح تصویر پڑھنے والے کے دل پر نقش نہیں ہوتی!

حیاتِ جاوید کے بعد شاید حیاتِ شبلی ہماری زبان کی سب سے مفصل اور وقیع سوانح عمری ہے۔ اور حیدرآباد کے ایک پروفیسر صاحب نے تو کہہ دیا ہے کہ سید سلیمان نے حیاتِ شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاجِ فضیلت چھین لیا جو حیاتِ جاوید کی بدولت اس کے سر پر تھا۔ افسوس ہے کہ حیاتِ شبلی پر تفصیلی تبصرہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس میں متعدد ٹھوس خوبیاں ہیں اور ایک دو شدید کوتاہی بھی۔ ان سب کے گنانے کا یہاں موقع نہیں ہے

خمِ زلف و رخت را شرح دادن
شبے باید دراز و ماہتابے

لیکن یہ تو شاید سید سلیمان بھی، نہ کہیں گے کہ انھوں نے ان ترقیوں سے جنھوں نے گذشتہ چالیس سال میں علم نفسیات کا نقشہ بدل دیا ہے۔ یا ان تبدیلیوں سے جو حیاتِ جاوید کی تصنیف کے بعد سیرت نگاری کے فن میں رونما ہوئی ہیں۔ کسی طرح بہرہ ور ہونے کی کوشش کی ہے

نہ صرف ہمارے ارباب علم وادب نے دوسرے ملکوں کی فنی اور علمی ترقیوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں بلکہ ملک میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے جو صحیح سیرت نگاری کے لئے بادِ سموم کا اثر رکھتا ہے۔ یعنی جس رفتار سے ہمارے اکابر اور راہنماؤں کی اخلاقی حالت تنزل کر رہی ہے۔ بالکل اسی تناسب سے قوم میں یہ جذبہ بڑھ رہا ہے کہ انہیں ہر طرح سے بے عیب و سقم بنا کر پیش کیا جائے۔ ع

ہر چہ از سرمایہ کاست، در ہوس افزودہ ایم

اس مقصد کے لئے نہ صرف سوانح نگار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ صاحب سیرت کی زندگی کی بعض بنیادی باتیں نظر انداز کر دے۔ بلکہ اب تو یہ کوشش ہو رہی ہے کہ سوانح نگار کو صحیح تصویر کھینچنے کے لئے جو رنگ و روغن درکار ہے۔ اس سے ہی محروم ہی کر دیا جائے اور صاحب تذکرہ کی زندگی کے متعلق جو مواد موجود ہے۔ اس میں سے وہ عناصر نکال لئے جائیں۔ جو عقیدت مندوں کو پسند نہیں!

سوانح نگاری کے متعلق قوم کے نقطۂ نظر میں جو تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ العزیز کے تذکرہ نگار تو ان کی نسبت لکھ دیتے ہیں کہ وہ حصولِ زمین کی خاطر سلطان شمس الدین التتمش سے ملنے، اجمیر سے دہلی آئے اور حضرت خواجہ کی شان میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اقبالؒ کا کوئی ایسا خط شائع

ہوجاتا ہے۔ جس میں حیدرآباد ہائی کورٹ کی ججی کے متعلق ایک خفیف سا اشارہ ہے۔ توان کے مداح بے قرار ہوجاتے ہیں!

شاید یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک قومی راہنما انسان نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کی جائز تکمیل کا سامان کرے۔ یا اس کے خاندان اور اس کی اولاد کا اس پر کوئی حق نہیں!!

اور انہیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اگر ان کے ہیرو کی زندگی میں بعض ایسی چیزیں ہیں۔ جو نظر کو کھٹکتی ہیں۔ تو کیا یہ اس کا فرض نہیں کہ وہ اپنی عملی زندگی کی اصلاح کرے اور کیا یہ قومی بہی خواہی کا راستہ ہے کہ حقیقت سے چشم پوشی کرکے تذکرہ نگار ریاکاری کے فروغ کا اور سامان کرے؟

آج سچی سیرت نگاری کے لئے ملک کی فضا ناسازگار ہے۔ قومی خیالات کی باگ ان لوگوں کے جانشینوں اور ہوا خواہوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو تمام عمر مذہب ـ مذہب پکارتے رہے۔ (اور فی الواقع انہیں مذہب سے شدید جذباتی محبت تھی) لیکن مذہب کی اصل روحانی خوبیوں یعنی باطنی پاکیزگی۔ تقوے اور اخلاقی ڈسپلن سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا۔ ان لوگوں کے مداح اب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے ممدوحوں کی زندگیاں قریب سے دیکھی جائیں اور ان کا نقشہ واقعات کے مطابق کھینچا جائے۔ ایک تذکرہ نویس کے لئے ایسی حالت میں حقیقت نگاری کی وادی میں قدم رکھنا اور اردو میں جدید سیرت نگاری کا نمونہ پیش کرنا اختلاف اور مخالفت کو دعوت دینا ہے۔ ایک سعیِ ناشکور کو ہاتھ میں لینا ہے۔ لیکن کیا اہل قلم پر سچائی۔ اصول فن۔ اور قومی بہی خواہی کی طرف سے کوئی فرض عائد نہیں ہوتا؟؟؟

اور شبلی کی زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالتے ہوئے اور حقیقت نگاری کو

مطمح نظر بناتے ہوئے، ہمیں اس خیال سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ یہ وہی طریقِ کار ہے۔ جس کی شبلی تلقین کرتا تھا۔

ہمیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس عمل سے شبلی کی اصل عظمت اور سربلندی میں (جو علمی۔ ادبی اور فنی ہے)۔ (اور مذہبی۔ اخلاقی یا روحانی نہیں) کوئی فرق نہیں آئے گا۔

اکرام

استدراک | سید سلیمان نے جس انداز سے شبلی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اس میں ہمارے طریقِ کار میں بعد المشرقین ہے۔ لیکن ناسپاسی ہوگی۔ اگر ہم یہاں ان سہولتوں اور آسانیوں کا اعتراف نہ کریں۔ جو حیاتِ شبلی کی بدولت ہمیں میسر آئیں۔ ہم نے شبلی کے متعلق قریب قریب سارا قابلِ حصول تحریری مواد خود دیکھا ہے اور دستِ طلب دور دور تک پھیلایا ہے۔ لیکن سید سلیمان کی کتاب میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن تک ہماری رسائی نہ تھی اور پھر ان کی کتاب میں شبلی کے واقعاتِ زندگی کو جس تاریخی تسلسل و تفصیل سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس نے ہمیں بہت سی زحمتِ غیر ضروری سے بچالیا۔

سید سلیمان ندوی کی نسبت ہم موجِ کوثر میں خوب زہر اگل چکے ہیں۔ (گو اگر بزرگانِ اعظم گڑھ ہماری جسارت نظر انداز کر کے، ہماری شکایات کو بہ نظرِ انصاف دیکھیں تو شاید انہیں ان میں اپنے ادارے کے بعض بڑھتے ہوئے امراض کا مداوا بھی نظر آجائے!) موجودہ کتاب میں بھی، ایک بحث میں، جہاں ہمارے خیال میں سید سلیمان نے میزانِ عدل کا پلہ جھکایا ہی نہیں، بالکل بٹھا دیا تھا۔ ہم نے اپنے خیالات بلاکم و کاست بیان کرنے

ہیں اور کوئی بات لگی لپٹی نہیں رکھی۔ یقین ہے کہ ہمیں سید سلیمان کے خاص عقیدت مندوں میں سے نہ گنا جائیگا۔ لیکن ہمیں سخت افسوس ہوگا۔ اگر ان چند شکایات و اختلافات کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ ہمارے دل میں سید سلیمان کی دوسری بے اندازہ اور ٹھوس، علمی، اخلاقی، اور روحانی خوبیوں کی قدر نہیں۔

سید سلیمان نے جس طرح حیاتِ شبلی میں شبلی کی زندگی کا ایک پہلو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس سے ہمیں اختلاف سہی۔ شبلی اور سر سید کے متعلق انھوں نے جس انداز سے بحث کی ہے۔ اس سے ہمارے خیال میں شبلی کو بجائے فائدے کے نقصان ہوگا لیکن آخر الاعمال بالنیات۔ سید سلیمان نے ان دونوں باتوں میں جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ اس کا سبب ایک نیک نیت اور سعادت مند شاگرد کی فرطِ عقیدت کے سوا کچھ نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ سوانح نگار کے لئے فرطِ عقیدت طرۂ دستار نہیں بلکہ زنجیر پا ہوتی ہے تو ہم کہیں گے کہ جو عقیدت مندی کسی سے حیاتِ شبلی جیسی سیر حاصل اور فاضلانہ کتاب لکھوا لے۔ اسے کس طرح ایک عیب سمجھا جا سکتا ہے؟ آپ مولف کی ایک آدھ بات سے اختلاف کر لیں لیکن اس میں جو ذخیرۂ معلومات جمع ہے۔ اس کی قدر نہ کرنا بے انصافی ہے۔ اگر آپ اسے مکمل سوانح عمری نہ بھی سمجھیں (اور کڑے نقطۂ نظر سے آخر ہماری زبان میں کتنی کامل سوانح عمریاں ہیں؟) تب بھی حیات شبلی میں فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے اور (بادش بخیر) دیارِ پورب کی کوئی سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے۔ اس کے احسان سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے؟

سید سلیمان کے علاوہ جناب عطیہ بیگم صاحبہ فیضی کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ جنھوں نے بکمال فیاضی ہمیں شبلی کے اصل خطوط اور ان کی دوسری قلمی تحریریں دیکھنے کو دیں۔ شبلی کی دو پرانی اور غیر متعارف تصاویر بہم پہنچائیں اور اپنی بیش قیمت خاندانی ڈائری سے شبلی کے متعلق اندراجات اور ان کے بعض غیر مطبوعہ اشعار نقل کرنے کا موقع دیا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب صوفی مصنف المنہاج (انگریزی) بھی ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ ان ہی کی بدولت، عطیہ بیگم صاحبہ تک ہماری رسائی ہوئی اور انھوں نے دو روز، ہمارے ساتھ شریک رہ کر شبلی اور بعض دوسرے اکابر (مثلاً اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد) کے متعلق، جو چیزیں ہم نقل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں نقل کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ڈاکٹر صاحب، شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے پرانے جاننے والوں میں سے ہیں اور ان کی گفتگو ان دو بزرگوں کے متعلق ان واقعات کا بیش بہا خزانہ ہوتی ہے۔ جن سے نئی نسل بہت حد تک نا آشنا ہے۔

آخر میں ایک افسوسناک فرض، جناب عبدالرزاق الغامدار مرحوم کا اعتراف احسان ہے۔ جن سے ہمیں الندوہ کے پرانے فائل اور بعض دوسری کتابیں مستعار ملیں۔ اور جو اس کتاب کے ایامِ تالیف میں وفات پا گئے۔ مرحوم ایک بڑے اخلاص شعار سادہ منش اور صاحب ذوق مسلمان تھے۔ اردو سے انھیں محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اور انھوں نے صوبہ بمبئی کے ایک دور دراز گوشے (بلگام) میں مطبوعہ اردو کتب و رسائل کا ایک ایسا بیش بہا ذخیرہ جمع کر لیا تھا جس کے ہم پایہ ذاتی کتب خانے شمالی ہندوستان میں بھی خال خال ہیں۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا کرے اور ان کے ورثہ کو توفیق دے کہ وہ مرحوم کے نیک کام جاری رکھ سکیں۔

حالی اور آزاد، محسن الملک اور وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے تھے؟ ایک یا دو یا تین کے۔ ان میں شبلی کی بوقلمونی کہاں سے آئیگی؟ جو رندوں میں رند تھے۔ زہاد میں زاہد۔ شاعروں میں شاعر، شعرا میں شاعر، معلموں میں معلم۔ مورخوں میں مورخ۔ سیاستدانوں میں سیاس۔ اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی۔ تعلیم میں نئی روش کے آموزگار اور علمی تصنیف و تالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار!

قلیل مدتِ حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا کیا وہ ایک معجزہ سے کم ہے؟

دبیرم۔ شاعرم۔ رندم۔ ندیمم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمے آید!

(موجِ کوثر)

شبلی نامہ

خاندان ـ طفولیت ـ تعلیم

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ راجپوت نسل سے تھے اور ان میں اس قوم کی ساری خودداری، زود حسی، اولوالعزمی، قبیلہ پروری اور جنگجوئی موجود تھی۔

لیکن وہ خالص راجپوت نہ تھے۔ ان میں بہت سا باہر کا خون ملا ہوا تھا۔ ان کا خاندانی لقب عام مسلمان راجپوتوں کی طرح کنور یا رانا یا چودھری یا خان نہ تھا۔ شیخ تھا اور ان میں وہ شہرت۔ علم و فضل اور مصلحت وقتی کے تحت اپنے صحیح خیالات و جذبات کو چھپا رکھنے کی عادت، جو راجپوتوں کے خاص اوصاف میں سے نہیں۔ صاف نمایاں ہے۔

ان کے سب سے پہلے بزرگ، جن تک سلسلۂ تحقیق و تفتیش کی کڑیاں پہنچتی ہیں۔ شیو راج سنگھ جی تھے۔ ان کے مسلمان ہونے کا ایک عجیب و غریب

قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو نہ صرف غایت درجہ دلچسپ ہے بلکہ شبلی کے موروثی طبعی رجحانات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ علامہ کے ایک عقیدت مند شاگرد، مولوی اقبال احمد سہیل اپنی نا تمام سیرت شبلی میں لکھتے ہیں :۔

"ایک دن (شیوراج سنگھ جی کو) شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منہ علاقہ زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا۔ اتفاقاً دیر ہو گئی۔ دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کر کے مکان پر پہنچے۔ بھوک پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے۔ گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے۔ یہ خیال نہیں رہا کہ جوتیاں باہر اتار دیں۔ ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے۔ اب تک بے آب و دانہ تھیں۔ بگڑ کر بولیں۔ "کیا نرے ترک ہی ہو گئے۔ جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا بھرشٹ کر ڈالا!"

یہ بھی ٹھہرے آخر راجپوت، ان کو بات کی برداشت کہاں!! وہ بھی ایسا شدید طعنہ اور عورت کے منہ سے!!

شیوراج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنتے ہی کہا کہ ہم کو ترک ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو سچ مچ ترک ہوئے جاتے ہیں!.....

اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جا کر نہ صرف اپنی تشنگی بجھائی بلکہ دینِ حق کے آبِ حیات سے بھی سیراب ہوئے اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا۔[1]"

خدا کی شان ہے۔ جب کسی کو راہِ ہدایت دکھانا ہو تو ایک عورت کا طعنہ

---

[1] الاصلاح۔ نومبر ۱۹۳۶ء

ہی نوائے سروش بن جاتا ہے اور وہ کام کر لیتا ہے جو سینکڑوں علماء کے وعظ و تبلیغ سے ممکن نہیں!

اور ٹھاکر شیو راج سنگھ جی کی طبیعت کی تیزی اور زود حسی بھی بھولنے کی چیز نہیں۔ کیونکہ ان کی اولاد کو بھی اس میں سے پورا پورا حصہ ملا تھا اور شبلی کی شخصیت میں کوئی چیز اس قدر نمایاں نہیں جتنی یہ شدید ذکاوت حس!!

شبلی نے ایک متمول گھر میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ شہر اعظم گڑھ کے رئیس اعظم تھے۔ وہ بہ یک وقت ایک کامیاب وکیل، ایک خوش حال زمیندار اور ایک اولوالعزم تاجر تھے۔ اس زمانے میں شہر کی میونسپل کمیٹی کا صدر حاکم ضلع ہوتا تھا۔ معززین شہر کی زیادہ سے زیادہ رسائی اس بات تک تھی کہ وہ آنریری سکریٹری ہو جائیں اور جب تک شیخ حبیب اللہ کی صحت نے اجازت دی۔ وہ اس عہدہ پر مامور رہے۔ وہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سے سمجھے جاتے تھے اور ان کی زمینداری بھی وسیع تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیسی شکر کے کارخانے اور نیل سازی کی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں۔ جن سے خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا۔ وہ سرکار کو چھ ہزار روپیہ سالانہ بطور مالگذاری ادا کرتے تھے اور ان کی کل سالانہ آمدنی کا اندازہ تیس ہزار (یعنی قریب قریب ایک کمشنر کی تنخواہ تک) کیا جاتا ہے۔

مولانا شبلی، جو ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے نواحی گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ شیخ حبیب اللہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ایک امیر گھرانے میں بڑے بیٹے کی جو عزت و خاطر ہوتی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں اور شیخ حبیب اللہ تو اپنی اولاد کی خوشی میں گھر لٹا دینے والے باپ تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے مہدی حسن ولایت سے تعلیم پا کر آئے تو شفیق والد نے جس

دھوم دھام سے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ آج تک اعظم گڑھ والوں کو بھولا نہیں۔ سات روز تک مسلسل اہلِ شہر کی دعوت رہی اور فیاضی اور امارت کا دل کھول کر مظاہرہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ شبلی کی اس گھر میں کتنی قدر و منزلت ہوگی۔ چنانچہ سید سلیمان لکھتے ہیں۔ "مولانا مرحوم کا بچپن بہت ناز و نعم میں گزرا" اور جو دو ایک واقعات ان کے بچپن کے ملتے ہیں۔ ان سے شبلی کے ماحول کی آسائش اور اُن کی اپنی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن اس بچے کے لئے اپنے ماحول میں فقط آرام و آسائش نہ تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو اس سے ایک طرح کی ضد تھی۔ اس کے لئے پھولوں کی جو سیج تیار ہوتی۔ اس میں کانٹوں کی بھی ایک صف ساتھ بچھ جاتی۔ یا پھول ہی کانٹوں میں تبدیل ہو جاتے۔ انگریزی ادب الاطفال میں ایک نومولود کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ جس کی پیدائش پر دور دور سے پریاں آئیں اور طرح طرح کی نعمتیں ساتھ لائیں۔ لیکن ایک خشمگین پری ایسی بھی آئی جس نے ان نعمتوں کو مصیبتوں میں بدل دیا۔

شبلی کے ساتھ بھی قدرت نے تمام عمر اسی طرح کی ستم ظریفی کی اور اس کا آغاز ان کے اپنے گھر سے ہوا۔ شبلی کا گھر ایک عیش و آرام کا گہوارہ تھا۔ خدا کا دیا، سب کچھ موجود تھا۔ شفیق باپ اور عزیز ماں کا سایہ ان کے سر پر تھا۔ لیکن جلد ہی اس فردوسِ مسرت میں بادِ صرصر کے جھونکے آنے شروع ہوئے۔ شبلی کے والد نے ایک اور شادی کر لی اور اس گھر کا شیرازۂ محبت بالکل درہم برہم ہو گیا!

شبلی اور شبلی کی والدہ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ان کی والدہ نے اس کے بعد تمام عمر روتے گزار دی۔ "شیخ صاحب نے غیر کفو میں جو

شادی کرلی تھی۔ اس سے وہ بہت دلگیر رہا کرتی تھیں اور آخر اسی غم میں وفات پائی۔" شبلی کو اپنی والدہ سے بیحد محبت تھی اور باپ کا یہ فعل سخت ناگوار تھا۔ والد کی ساری زندگی میں انھوں نے سوتیلی ماں سے بات نہیں کی۔ اس کے گھر نہیں گئے اور جب باپ کی وفات کے بعد وہ اپنی سوتیلی والدہ سے وہ جائداد، جو اسے ان کے والد دے گئے تھے۔ بخشوانے گئے (اور وہ باہمت خاتون نہائت فیاضی سے، خاندانی مصلحتوں کی خاطر، اپنے حقوق سے دست بردار ہوگئی) تب بھی اس کا ذکر خطوں میں انھوں نے "چھادنی" کہہ کر نہایت کراہت سے کیا ہے!

اس واقعے نے گھر کی عام فضا پر اثر ڈالا۔ شبلی اور اس کے والد کے درمیان کئی موقعوں پر تکدر کے آثار ملتے ہیں۔ جب وہ تعلیم کی غرض سے لاہور گئے ہیں تو جس تنگی ترشی سے انھوں نے آٹھ دس روپے میں دو مہینے گزارے اور والد کو تکلیف نہ دی ("چوں مزاج عالی اندکے برہمی داشتند") اس سے باپ بیٹے کے بعد کے تعلقات کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے!

سوتیلی ماں کی آمد کے بعد شبلی کی خانگی مسرت عنقا ہوگئی لیکن اب بھی ایک میدان ایسا تھا۔ جس میں ان کے لئے طمانیت و کامیابی کے پھول کھلتے تھے۔ اب ان کی تعلیم شروع ہوگئی تھی اور چونکہ وہ ذہین اور طباع تھے اور دل لگا کر پڑھتے تھے۔ اس لئے ہم جینوں میں ممتاز رہتے اور جو خوشی انھیں اپنے گھر میں نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ مدرسے کی چار دیواری میں مل جاتی۔

شبلی کی تعلیم چھ برس کی عمر میں شروع ہوئی اور اگرچہ ایک لحاظ سے اخذ علوم کا سلسلہ تمام عمر جاری رہا لیکن ۱۸۷۶ء میں جب وہ حج کو

غرض سے روانہ ہوئے۔ ان کی رسمی تعلیم کا خاتمہ ہوگیا۔

مولینا نے کلامِ مجید اور فارسی کی کتابیں اپنے گاؤں بندول میں پڑھیں۔ پھر اعظم گڑھ کے عربی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ چند روز جونپور میں بھی پڑھا اس کے بعد، ان کے والد نے انھیں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے غازی پور بھیج دیا۔ مولانا کی اصل تعلیم کا زمانہ یہی تھا۔ یہاں سے فراغت کے بعد، مولانا نے اس زمانے کے دستور کے مطابق مختلف اساتذۂ فن سے فیض حاصل کرنے کے لئے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ ایک مہینہ دیوبند رہے اور علم الفرائض کا ایک رسالہ پڑھا۔ کچھ عرصہ رام پور میں گزارا اور مولانا ارشاد حسین سے فقہ اور اصول کی تعلیم حاصل کی۔ پھر لاہور گئے اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور کی خدمت میں چند مہینے حاضر رہ کر عربی ادب کا صحیح مذاق پیدا کیا۔ اخیر میں حدیث کی طرف توجہ کی اور مولانا احمد علی سہارنپوری سے سنن ترمذی کا درس شروع کیا تھا کہ ان کے والد اور دوسرے اعزہ نے حج کا قصد کیا اور شبلی نے اپنے اُستاد کے اشارے سے اخذِ علوم پر مذہبی ارکان کی بجا آوری کو ترجیح دی اور سہارنپور سے بمبئی روانہ ہوگئے۔

مولانا شبلی نے طلب علوم میں اپنا دامن دور دور تک پھیلایا۔ اور مختلف علوم، مثلاً ادب، منطق، حدیث میں جو جو اساتذہ اپنے فن میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔ ان تک رسائی حاصل کی۔ اس ذہین و محنتی طالبعلم نے ہر جگہ سے فیض حاصل کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک دو مہینے میں کسی درسگاہ کی خصوصیتیں اخذ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس دوران میں کسی علم کی ایک آدھ شاخ کی تعلیم ہو جائے تو ہو جائے۔ لیکن ذہن اور طبیعت کی اصلاح ایک دو مہینے میں کس طرح کیجا سکتی ہے؟

چنانچہ شبلی پر دیوبند اور سہارنپور کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے ابتدائی اساتذہ میں سے (شاید سوائے مولانا فیض الحسن کے جنھوں نے ان کے ادب عربی کے مذاق کو سنوارا) جس شخص نے ان کے دل و دماغ پر اپنی شخصیت کا گہرا نقش چھوڑا اور انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ وہ مولانا محمدؒ فاروق چریا کوٹی تھے۔

مولانا شبلی، ان کی نسبت لکھتے ہیں :۔

"میں نے معقولات کی تمام کتابیں، مثلاً میر زاہد۔ مُلا جلال مع میر زاہد۔ حمد اللہ۔ شرح مطالع۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔ ان ہی سے پڑھیں اور میری تمام تر کائنات ان ہی کے افادات ہیں۔ فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے۔ اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے۔"

معقولات، جس میں مولانا محمدؒ فاروق کو خاص طور پر دسترس تھی۔ عقلی و قیاسی علوم، مثلاً فلسفہ، منطق، کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے بلادِ شرقی میں بے حد فروغ ہوا ہے۔ امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے والد نے ان علوم کے ایک مشہور ماہر، میرزا زاہد ہروی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اور وہ خود بھی ان سے پوری طرح باخبر تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے جو درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں ان علوم سے دانستہ بے توجہی برتی گئی۔ اس مسلک کے بزرگوں کا خیال تھا کہ ان علوم میں غیر معمولی شغف سے انسان کو خیالی اور قیاسی بحثوں سے محبت ہو جاتی ہے اور ان کا جو فائدہ ہے۔ وہ ظاہری ہے۔ باطنی اصلاح اور اخلاقی سربلندی میں ان سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ تفسیر و حدیث کے

مقابلے میں، جن پر شاہ ولی اللہ نے زور دیا۔ یہ علوم دنیوی علوم ہیں۔ انھیں مذہبی علوم سمجھنا یا اسلامی طریقۂ تعلیم کا ضروری جزو بتانا محض حسنِ ظن ہے۔

معقولات سے جن حضرات نے بے اعتنائی برتی۔ ان کا طریق کامی معقول وجوہات اور ایک بلیغ حکمت پر مبنی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی حکومت کے آخری دور میں ان علوم نے بے انتہا ترقی کی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اگرچہ درس و تدریس میں ان علوم کو بنیادی اہمیت دینا بہت سی مصلحتوں کے خلاف تھا اور ان علوم کے ماہرین کو اپنی قیاسی بحثوں اور خیالی معلومات پر جو غیر معمولی ناز تھا۔ وہ تو بیجا اور علم و فن کے لئے ایک خطرہ تھا لیکن ایک سمجھدار اُستاد کے ہاتھ میں یہ علوم طالب علم کی ذہنی تربیت کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ ان سے غور و فکر کی عادت راسخ ہو جاتی۔ خیالات کو باقاعدہ ترتیب سے پیش کرنے کی مشق ہوتی اور مخالفین کے بیان میں عیب نکالنے اور اپنا سکہ بٹھانے کا ملکہ پیدا ہو جاتا۔

۱ مولانا فاروق کو معقولات سے غیر معمولی شغف تھا اور انھوں نے ہونہار شاگرد کو بڑی محنت اور محبت سے تعلیم دی[1]۔ چنانچہ شبلی میں اگر ایک دو ایسی کوتاہیاں رہ گئیں جن سے معقولات کے مخالف ڈراتے ہیں۔ تو

---

[1] ہندوستان میں معقولات کا اصل مرکز لکھنؤ کا فرنگی محل ہے لیکن وہاں علومِ ظاہری کی تعلیم کے ساتھ باطنی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے وہاں معقولات کے وہ اثرات پوری طرح نظر نہیں آتے۔ جو شبلی کی ذات میں نمایاں ہوئے جو (اپنے اُستاد کی طرح؟) معقولات اور ظاہری علوم میں تو یدِ طولیٰ رکھتے تھے لیکن باطنی تعلیم اور روحانی تربیت سے یکسر محروم رہے۔

معقولیوں کی ساری خوبیاں بھی ان میں موجود تھیں۔ مولانا فاروق کے زیر اثر ان کا ذہن بڑی ترقی کر گیا۔ خیالات میں ایک منطقی ترتیب آگئی اور مناظروں میں حریف کو نیچا دکھانے کی اہلیت پیدا ہوگئی بلکہ طبیعت پر ایک ایسا مناظرانہ رنگ غالب آگیا جو تمام عمر ان کی تحریر و تقریر کا مابہ الامتیاز رہا۔

مولانا محمد فاروق کی صحبت و تعلیم نے ہونہار شاگرد کے ذہن کو جلا دے دی لیکن شبلی کا وہ رنگِ طبیعت، جس پر بعد میں محتاط اور متقی، علما کی جماعت معترض ہوئی۔ اسی صحبت میں پرورش پاتا رہا اور شاگرد کے علاوہ اُستاد میں بھی جلوہ نما تھا۔ مولانا فاروق اس زمانے کے مشہور عالم تھے لیکن شبلی کی فطرت کی تشنویت اور بوقلمونی ان میں بھی موجود تھی۔ وہ بہ یک وقت مذہبی عالم اور عدالتی وکیل تھے۔ مذہبی درسگاہوں کی بھی وہ رونق تھے اور فنِ موسیقی پر فریفتہ تھے۔ شمعِ علم کے بھی وہ شیدا تھے اور عشقیہ شعر بھی خوب لکھتے تھے۔ مذہبی بحثوں میں بڑے جوش سے حصہ لیتے تھے لیکن ارکانِ مذہب کی بجا آوری میں بقولِ شبلی "خود بے پروا تھے"۔

وہ خود ایک مثنوی میں اپنی طبیعت کا نقشہ کھینچتے ہیں ؎

نے بینی کہ طرفہ بلبلم من | کزیں اعجوبۂ ہر محفلم من
بہر میداں نمودم ترکتازی | بخواندم نامۂ ترکی و تازی
گہے از لوحِ رازی خواندہ ام حرف | گہے از حرفِ تازی بستہ ام طرف
گہے اندر مقامِ لحنِ شیراز | شدم با اہلی و سعدی ہم آواز
گہے در بزم گاہِ نغمہ سازی | سخن راندم با آہنگِ حجازی

حسودا! آں فروزاں گوہرِ من   کہ شمعِ من بہ ہر بزمے است روشن!

چنانچہ شاگرد پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ جو بعد میں اس کی وساطت سے طلبائے ندوہ کو وراثت میں ملا اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ شبلی کے لئے بڑی مشکلات کا باعث ہوا۔

شبلی کی قدامت پسندی کو بھی مولانا محمد فاروق کی صحبت نے بہت بھڑکا دیا۔ مولانا فاروق ایک بوقلموں شخصیت کے مالک اور ایک ہر فن مولا بزرگ تھے۔ لیکن انھیں زمانے کے نئے طور طریقوں سے بڑی نفرت تھی۔ سرسید نے نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو تحریک جاری کی تھی۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اس کے "بڑے مخالفوں میں سے تھے"۔ حالی نے مسدسِ حالی لکھا۔ تو فاروق نے اس کے جواب میں مسدس عوالی ترتیب دیا۔ قرین قیاس ہے کہ اس ماحول میں شبلی کی قدامت پسندی کو بڑی تقویت ملی اور اگرچہ علی گڑھ جا کر وہ خود جدید تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن بالآخر ان کا ابتدائی ذوق غالب آیا اور جدید کے خلاف قدیم کو مستحکم کرنے میں انھوں نے وہ کام کیا جو مولانا محمد فاروق کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا!

مولانا محمد فاروق کو اپنے شاگرد پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو عرینِ دانش کا شیر اور شاگرد کو بچہ شیر کہتے تھے۔ اُستاد نے فخر یہ شاگرد کا سجع کہا۔ اَنَا اَسَدٌ وَ اَنْتَ شِبْلِیْ یعنی میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ۔[1]

[1] ۱۹۰۷ء میں جب مولانا شبلی کا پاؤں کٹا۔ تو مولانا محمد فاروق نے ایک فارسی مثنوی میں "بڑے پیار اور محبت سے اپنے شاگرد کی بیمار پرسی کی"۔ اس کا ایک شعر ہے ؎ تیرے از چرخ خود پسند رسید   شبلی ات را بہ پا گزند رسید
شبلی ات کی ترکیب سے اُستاد کے جوشِ محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے

اسی فقرے سے اُستاد و شاگرد کے تعلقات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مدرسے کی چار دیواری میں یہ جوہرِ قابل کس طرح چمک رہا تھا۔

علامہ شبلی نے فقط درسی کتب پر اکتفا نہیں کی بلکہ عام کتب بینی کا ذوق و شوق جوان کے لئے سرمایۂ حیات ہونے والا تھا۔ ابتدا سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ بچپن میں ہی فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دکان پر بسر کرتے۔ کتابیں اُلٹتے پلٹتے۔ شعرا کے دیوان پڑھتے اور مناسبتِ طبع سے انھیں اچھے اشعار یاد رہ جاتے۔

شعر گوئی بھی اس عمر میں شروع ہو گئی تھی۔ ان کے سب سے پہلے معلم کا بیان ہے کہ ایک رات کو وہ سوئے ہوئے تھے۔ قریب ایک بجے کا وقت تھا۔ یک بیک جوان کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی شبلی ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعۂ تاریخ کی تصنیف ہو رہی ہے!!

مولانا کے مذاقِ شعر گوئی کی اصلاح و تربیت اس وقت ہوئی۔ جب وہ مولانا محمدؒ فاروق کے حلقۂ درس میں آئے۔ مولانا غازی پور میں اُستاد کے پاس ہی رہتے تھے۔ پھر شاگرد کی کشش اُستاد کو اعظم گڑھ لے آئی۔ دونوں میں اُستاد اور شاگرد کا رسمی تعلق نہ تھا بلکہ حد درجہ دلبستگی اور مذاق کی یگانگت تھی۔ مولانا محمد فاروقؒ نہایت شُستہ فارسی شعر کہتے تھے۔ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ اُنکی صحبت میں مولانا کو فارسی شعر گوئی کا پاکیزہ مذاق حاصل ہو گیا۔ اور یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انکے اس زمانے کے فارسی اشعار اُردو اشعار سے بہتر ہیں۔

لطیفہ ۔ مولانا محمدؒ فاروق اور شبلی کی نسبت ایک واقعہ بیان کیا

جاتا ہے۔ جن سے دونوں کی بے تکلفی اور شبلی کی حاضر جوابی (اور انانیت!) کا اندازہ ہوگا۔ ایک دفعہ شاگرد ننگے سر بیٹھا تھا۔ اُستاد نے پیچھے سے آکر سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور مذاق سے کہا:

ہے گا چپت گاہِ خلائق یہ سر

شاگرد نے فوراً جواب دیا:

جتنے ہیں سر ان پہ ہے فائق یہ سر

ا مولانا محمدؐ فاروق فقط ایک معقولی اور شاعر نہ تھے۔ ایک زبردست ادیب بھی۔ اخیر عمر میں جب ندوہ میں ان کا تقرر ادیب اوّل کی حیثیت سے ہوا۔ تو الندوہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا "ہندوستان میں مولانا علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ علم و ادب سے یہ دلچسپی اور ادیبانہ رنگ مولانا کے فخر استاد شاگرد شبلی کو بھی ملا بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ برخلاف علی گڑھ کے جہاں علم جدید کی تعلیم ہوتی ہے اور دیوبند کے، جو مذہبی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ شبلی کے ندوۃ العلما اور دارالمصنفین کا مابہ الامتیاز وہ ادبی رنگ ہے۔ جو مولانا محمد فاروق کی عربی اور فارسی، تحریر و تقریر میں جھلکتا تھا اور جسے ان کے لائق شاگرد نے بڑی اصلاح و اضافہ کے بعد اردو میں منتقل کیا۔"

لہ افسوس کہ مولانا محمدؐ فاروق کے حالات و تصنیفات جمع کرنے کی پوری کوشش نہیں ہوئی۔ شبلی نے الندوہ میں ایک مختصر سا نوٹ لکھا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے اس پر اضافہ کیا ہے لیکن ان کے حالات میں ایک مستقل مضمون کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ بالخصوص اگر ان کا مسدس عوالی، جو انھوں نے مسدس حالی کے جواب میں لکھا تھا۔ شائع کر دیا جائے۔ تو ان کے رنگِ طبیعت اور شبلی کے ابتدائی ماحول پر اور روشنی پڑے۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

مولانا شبلی نے طلبِ علم کی منزلوں میں بڑھ چڑھ کے قدم مارا تھا اور انھیں اس راہ کے طے کرنے میں وہی مسرت حاصل ہوتی تھی جو ایک عاشقِ صادق کو دیارِ محبوب کی سیر میں ملتی ہے ۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ)

ہم مولانا شبلی کی ابتدائی ادیبانہ تربیت کے پوری طرح معترف ہیں اور سید سلیمان سے اس بات میں متفق ہیں کہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں انشا پردازی کا بڑا زور آگیا تھا لیکن ہمیں خفیف سا خیال ہے کہ مسئلہ قراۃ خلف الامام کے جس رسالے پر سید سلیمان نے اپنے دعوے کی بنیاد رکھی ہے ۔ شاید وہ شبلی کا نہ تھا بلکہ ان کے استاد کا تھا ۔ اس شبہ کے وجوہ بالاختصار یہ ہیں (۱) جیسا کہ سید سلیمان خود بتاتے ہیں شبلی نے اس زمانے میں " اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے "۔ اس زمانے میں شاگردوں کے نام سے (بالخصوص اختلافی مسائل میں) رسالے شائع کرنا عام بات تھی (۲) رسالہ کی طباعت کے وقت شبلی کی عمر فقط ۱۶ سال کی تھی اور ان کے قلم سے یہ رسالہ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے (۳) ایجاز و اختصار کا، جو شبلی کے طرزِ تحریر کی شروع سے خصوصیت رہے ہیں ۔ (مثلاً ان کے تمام ابتدائی فارسی مکاتیب میں) اس رسالے میں کوئی سراغ نہیں ۔ بلکہ طرزِ تحریر بالکل اس کے برعکس ہے (۴) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب شبلی سے ایک زمانے میں پوچھا گیا کہ ان کی سب سے پہلی تصنیف کونسی ہے تو انھوں نے ایک عربی رسالہ اسکات المعتدی کا حوالہ دیا ۔ اور اس کے بعد "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کا، جس پر انھوں نے ۱۸۸۷ء میں ایک رسالہ لکھا تھا ۔ (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۲۳۵)

قرینِ قیاس ہے کہ اگر مسئلہ قراۃ خلف الامام والا رسالہ شبلی کا اپنا ہوتا تو وہ اس کا ضرور ذکر کرتے ۔

دیکھئے۔ مولانا کی قسمت میں نہ تھا کہ کسی چیز سے انھیں دوامی مسرت حاصل ہو۔ وہ اپنے لئے عیش و طرب کا جو جام تیار کرتے یا تو وہ جام ہی ان سے چھن جاتا یا بادۂ مسرت زہرِ تلخ کام میں بدل جاتا۔

اُنھوں نے تمام تعلیم قدیم مدارس میں حاصل کی تھی جس وقت وہ مکتب میں گئے۔ اس وقت یہی نظامِ تعلیم مقبول تھا۔ ان کے والد بقول سید سلیمان ندوی "اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب و ہوا سے ناآشنا تھے۔" لیکن اس سے کچھ عرصہ بعد ایک شخص سید احمد خاں نامی غازی پور اور بنارس میں سب جج ہو کر آیا اور اُس نے بچّوں کو نئی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ قربِ مقامی کی وجہ سے اس نے اعظم گڑھ میں بھی کئی لکچر دئے اور شبلی کے والد اس کی تحریر و تقریر سے متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے شبلی کے سوا باقی سب بچّوں کو انگریزی طرز کے اسکولوں میں داخل کیا۔ ایک کو ولائت تک بھجوایا اور باقیوں کو بھی کالج کی تعلیم دی۔

اب مولانا شبلی اپنے گھر میں یکہ و تنہا قدیم تعلیم کے ترجمان تھے۔ انھوں نے اس طریقِ تعلیم کی سب سے اونچی چوٹیوں کو سر کیا تھا اور اس پر انھیں بڑا ناز تھا۔ لیکن اب ان سے کہا جا رہا تھا کہ ان چوٹیوں کے سر کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جو کچھ ہے نئی تعلیم ہے۔ شبلی کے حسّاس دل پر اس کا جو اثر ہوتا ہوگا۔ ظاہر ہے[1]۔ نئی تعلیم کی مقبولیت نے ان کی مسرت و طمانیت کے خرمن میں اسی طرح آگ لگا دی۔ جس طرح سوتیلی ماں کی آمد نے ان کے خانگی سکون کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا اور اب نئی تعلیم کی نسبت ان کے

---

[1] "مولانا (شبلی) کے لئے شیخ (حبیب اللہ) صاحب کے خیالات میں بہ جد بد تغیر سخت سوہانِ روح کا باعث تھا۔" [سیرت شبلی از مولوی اقبال احمد سہیل]

دل میں وہی خیالات تھے جو سوتیلی ماں کی نسبت تھے اور جب حصولِ تعلیم کے بعد انھیں ایک عرصے تک تلاشِ ملازمت میں ٹھوکریں کھانی پڑیں تو یہ غم و غصّہ اور گہرا ہو گیا۔

وہ ایک خط میں، ان عزیزوں کی نسبت جو انھیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ جل کر لکھتے ہیں۔

عزیزاں گویند کہ بغیر از تعلّم انگریزی نخواہی بسر بُرد ایں خود چہ حرف است

جمعے راہیں کہ ہیچ از انگریزی نخواندہ اند۔ و باز بناسب جلیلہ مے رسند۔

اور فی الواقع انھیں تلاشِ روزگار میں جو صعوبتیں اُٹھانی پڑیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے اس بات پر حیرانی بھی نہیں ہوتی کہ اس زمانے میں ان کے غم و غصہ کی ایسی حالت کیوں تھی؟

عنفوانِ شباب

حج سے واپسی کے بعد بھی، شبلی ابھی طلبِ علم کے کوچے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے مگر ان کے والد مُصر ہوئے کہ وہ اب کتابوں کو چھوڑ کر دنیوی زندگی میں قدم رکھیں۔ مولانا نے علم وفن سے اپنا سلسلہ بالکل منقطع تو نہ کیا لیکن انھیں والد کے حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا اور تلاشِ روزگار کی کٹھن منزل شروع ہوئی۔ جب دو تین سال تک بھٹکنے کے بعد کوئی ٹھکانہ نہ ملا تو مولانا کے والد نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ وکالت کا امتحان پاس کر کے' اعظم گڑھ میں وکالت شروع کریں۔ چنانچہ شبلی نے تیاری شروع کی اور ۱۸۷۹ء میں وکالت کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن وہ پہلی مرتبہ ناکام رہے اور خدا کی قدرت' اُن کا چھوٹا بھائی مہدی' جسے وہ اپنی کتابوں کے مضامین سُنایا کرتے تھے۔ اور جو محض تفریح طبع کے طور پر امتحان میں بیٹھا تھا کامیاب ہو گیا!

مولانا کی حساس طبیعت کے لئے یہ ایک اور رچکا تھا۔ اگلے سال انھوں نے زیادہ محنت اور باقاعدگی سے امتحان کی تیاری کی اور کامیاب ہو کر اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی لیکن وہ طبعاً مغرور اور کم آمیز تھے (وہ اس سے ایک سال بعد لکھتے ہیں۔ "من کہ از آشفتہ سری و شوریدہ مزاجی تن بہ آمیزشِ کسے نمے دادم") وکالت میں اس طبیعت کے ساتھ کامیابی ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے وکالت، والد کے حکم کے مطابق طوعاً وکرہاً شروع کی تھی۔ انھیں اس سے کوئی ذاتی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی

وکالت نہ چلی اور کچھ عرصے کے بعد انھیں یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔

وکالت سے مایوسی کے بعد شبلی نے سرکاری ملازمت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس وقت کلکٹر کی کچہری میں دس روپے کی نقل نویسی عارضی طور پر خالی تھی اور مولانا کا اس پر تقرر ہوا۔ اس کے بعد قرق امین کی اسامی خالی ہوئی تو شبلی کو دو مہینے کے لئے وہ جگہ دی گئی۔ مولانا نے اپنا کام بڑی محنت سے کیا لیکن یا تو وہ اسامی عارضی تھی یا شبلی سرکاری ملازمت کے لئے ہی موزوں نہ تھے۔ انھیں کارگزاری کی کوئی داد نہ ملی بلکہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ان کے تقرر کا ہی حکم جاری نہ ہوا!

جب سرکاری ملازمت بھی ایک سراب ثابت ہوئی (اور مولانا پچیس سال کی عمر تک پہنچ جانے کی وجہ سے قواعد کی رو سے نئی مستقل ملازمت کے اہل نہ رہے) تو ان کے والد نے انھیں اپنے کام پر لگایا۔ شیخ حبیب اللہ وسیع پیمانے پر نیل سازی کی تجارت کرتے تھے اور ان کے اطراف میں کئی گودام تھے۔ اُنھوں نے ایک گودام کی نگرانی مولانا کے سپرد کردی۔ یہ کام مولانا کو سخت ناگوار تھا اور کچھ عرصے کے بعد وہ اُسے ترک کرکے گھر واپس چلے آئے۔ اتفاق سے اس زمانے میں مولوی محمد کامل صاحب ولیدپوری جو ضلع بستی میں منصف تھے۔ اعظم گڑھ آئے اور مولانا کی بے شغلی دیکھ کر انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں مولانا نے چند مہینے بستی میں وکالت کی۔

تعلیم سے فراغت اور حصولِ روزگار کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر ایک کشمکش اور اُمید و بیم کا زمانہ ہوتا ہے اور شبلی کو جن حالات سے سابقہ پڑا وہ تو غیر معمولی طور پر افسوس ناک اور مایوس کن تھے۔

لیکن ان کی ہمت کی داد دینی چاہئے کہ ان نامساعد حالات میں بھی وہ ایک لمحہ کے لئے اپنے درخشاں مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے۔ شبلی کے جاننے والے انھیں متکبر اور خود پسند سمجھتے تھے لیکن ایک تو قدرت نے انھیں جو صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ ان کی بنا پر یہ تکبر بیجا نہ تھا اور پھر جو تکبر و خود پسندی انسان کو ہمت شکن حالات کے سامنے سر جھکانے سے بچاتی ہے وہ ایک برائی نہیں۔ خوبی ہے۔

شبلی نے اس زمانے میں در در کی ٹھوکریں کھائیں وہ نہایت معمولی عہدوں پر ناکام رہے تھے۔ ان کے حساس دل پر ان ناکامیوں کا جو اثر ہوتا ہوگا۔ وہ ظاہر ہے۔ ان کے زمانے کے خطوط رنج و الم اور بے چینی سے پر ہیں لیکن غموں کی اس تاریک گھٹا میں بھی ان کی ہمت اور خود اعتمادی کا ماہتاب روشن رہا۔ وہ اس زمانے میں بھی، جب انھیں پندرہ روپے کی قرق امینی کے ناقابل سمجھا گیا۔ لکھتے ہیں :-

من خود دریں خیال از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ با ایںہمہ خواری ہا

ہماں شبلی ام کہ بودہ ام و اگر گاہے بختم یاوری کرد۔ ہماں خواہم بود کہ ہستم۔

شبلی سمجھتے کہ نقل نویسی اور قرق امینی میں ان کی ناکامی اس وجہ سے نہ تھی کہ ان میں قابلیت کی کمی تھی بلکہ اس کا باعث یہ تھا کہ ان چیزوں سے انھیں کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ مرغوں اور مرغیوں کی نمائش میں اگر بلبل خوش الحان کو کوئی انعام نہ ملے تو اس سے اس کی خوش الحانی میں فرق نہیں آجاتا۔ شبلی کی تمام دلچسپیاں علمی اور ادبی تھیں اور وہ اس وقت کا انتظار کرتے رہے۔ جب خوش قسمتی سے، قدرت نے ان کے مذاق کے مطابق ان کے روزگار کا انتظام کر دیا۔

اس دوران میں وہ اپنے والد کی خوشنودی کے لئے تلاشِ روزگار میں مشغول رہے لیکن انھوں نے اپنی علمی اور ادبی دلچسپیاں بھی برقرار رکھیں اور یقیناً ان سے اس رنج و ناکامی کے عالم میں دل کو تسکین اور قرار ملتا ہوگا تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے اپنے اقارب اور دوستوں کو بعض کتابیں پڑھائیں لیکن اس زمانے میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ مناظرہ بازی اور غیر مقلدوں کی مخالفت تھا۔

اس زمانے میں اہل حدیث کا فرقہ نیا نیا شروع ہوا تھا اور ان کی مخالفت اور موافقت میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ شبلی کے اُستاد مولانا محمد فاروق ایک خالی حنفی تھے۔ پتہ نہیں۔ ان کی صحبت کا اثر تھا یا قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہر اصولی بات میں یہ نوجوان جدید کے مقابلے میں قدیم کی حمایت کرے۔ شبلی بھی غیر مقلدوں (اہلِ حدیث یا وہابیوں) کے سخت مخالف ہو گئے بلکہ حنفیت کے جوش میں اپنا لقب ہی نعمانی اختیار کیا۔

شبلی شدید احساسات کے انسان تھے۔ وہ جب کسی چیز کے حق میں ہوتے تو اسے آسمان تک پہنچا دیتے اور جب مخالفت شروع کرتے تو بسا اوقات اعتدال اور انصاف سے آنکھیں بند کر لیتے۔ چنانچہ ان کا اس زمانے کا ایک قول معارف میں نقل ہوا ہے کہ "انسان عیسائی ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔" اس زمانے میں اعظم گڑھ کے ضلع میں تقلید اور غیر تقلید کا خاص طور پر چرچا تھا جب مولانا یہ سُن پاتے کہ ضلع کے کسی گاؤں میں کوئی شخص غیر مقلد ہوا ہے یا کوئی غیر مقلد باہر سے آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرے کا چیلنج دیتے!

لیکن مولانا کے عنفوانِ شباب کے سارے مشغلے ٹھیٹھ مولویانہ قسم کے نہ تھے۔ ان میں ایک شدید شاعرانہ حس بھی تھی۔ خدا نے انھیں دلِ گرم اور طبع موزوں عطا کی تھی۔ شعر گوئی اُنھوں نے اس زمانے میں شروع کی تھی۔ جب وہ ابھی مدرسے میں ابجد خوانی کرتے تھے سید سلیمان نے اس سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا کو بچپن میں اوڑھنے کے لئے چادر کی ضرورت پڑی۔ مولانا کے والد شہر کے رئیس تھے۔ شبلی کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک رئیس کے بیٹے کو چادر نہ ملے اُنھوں نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر پیش کیا[۵]

پدر جس کا یوں صاحبِ تاج ہو!
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو!

باپ بہت خوش ہوئے اور بیٹے کو چادر انعام دی!

مولانا شبلی کے مذاقِ شعر گوئی کی اصلاح، اُن کے محسن اور جاں نثار استاد، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی نے کی/ لیکن ان کی ابتدائی اردو شاعری پر سب سے زیادہ اثر اودھ پنچ اور پیامِ یار کا تھا۔ اودھ پنچ ۱۸۸۵ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ اس طبقے کا ترجمان تھا جس کا خیال تھا کہ ہندوستان، بالخصوص لکھنؤ اور اودھ کی ہر ایک چیز بے عیب ہے اور اس میں کسی اصلاح یا تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ ایک عرصے تک اس اخبار نے حالی کی جدید شاعری کو اپنی تمسخر نگاری کا تختۂ مشق بنائے رکھا اور بڑے فخر سے کہا ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

سرسید کی اصلاحی تحریک کے خلاف اس اخبار میں اکبر الہ آبادی اور دوسروں نے جو کچھ لکھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ مولانا شبلی قدیم کے دلدادہ تھے۔ وہ اس اخبار کو بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ اس میں چھپی ہوئی بعض طویل نظمیں انھوں نے یاد کر رکھی تھیں اور آخیر عمر تک اپنے منتخب شاگردوں اور یارانِ طریقت کو سُنایا کرتے تھے۔

اس زمانے میں مولانا کا دوسرا دلپسند رسالہ لکھنؤ کا پیامِ یار تھا۔ یہ غزلیات کا ایک مجموعہ تھا جسے منشی نثار حسین نکالا کرتے تھے۔ منشی صاحب شبلی کے بے تکلف دوست تھے اور چوک میں ان کی عطر کی دکان تھی۔ مولانا جب لکھنؤ جاتے تو شام کو منشی صاحب کے پاس جا بیٹھتے بے تکلف احباب کے ساتھ خوش گپیاں کرتے۔ منشی نثار حسین سے مولانا کی دوستی دیر تک برقرار رہی اور ان کی دو تصانیف مثنوی صبحِ اُمید اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم منشی صاحب کے ذریعہ سے شائع ہوئیں۔

اودھ پنچ اور پیامِ یار دو ایسے پرچے تھے جن سے ایک مذہبی عالم کا تعلق خاطر بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہو گا لیکن مولانا فقط ایک مذہبی عالم نہ تھے۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور ان کی شخصیت میں ایسے عناصر موجود تھے۔ جن کی ان پرچوں سے تسکین ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جہاں تک ہمیں نظر آتا ہے۔ ان پرچوں سے مولانا نے کوئی برا ناخوشگوار اثر اخذ نہیں کیا۔ ان کے مطالعہ سے ان کی زبان میں شگفتگی آگئی۔ خیالات میں تنوع پیدا ہو گیا لیکن وہ خود ان رسالوں کی سقیم رندانہ فضا سے متاثر نہ ہوئے۔ مولانا میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ قعرِ دریا میں غوطہ زن ہونے کے بعد باوجود اپنا دامن تر نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ خود ایک

اہم خط میں، جو نومبر ۱۹۲۳ء کے معارف میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں :۔

بچپن سے میری صحبت بدچلن لوگوں میں تھی اور وہ لوگ ہمیشہ ان مشاغل کی تحریک کرتے تھے لیکن کبھی ناچ، رنگ، بلکہ گانے میں بھی شریک نہ ہوا۔

مولانا کی اس زمانے کی اردو غزلوں میں کوئی خاص بات نہیں۔ رسمی عاشقانہ اشعار ہیں ؎

ضعف میں بھی یہ مری تیزیِ فغاں کا زور ہے ۔۔۔ روک لے اس کو کہاں آسماں میں زور ہے
نیست کھل سکی کمر پر تو نے ثابت کر دیا ۔۔۔ واہ واہ تسلیم کیا تیرے بیاں میں زور ہے

شروانی صاحب کے خط میں ایک اور شعر نقل ہوا ہے ؎

بیخودی وصل کی، حظ کب مجھے لینے دیتی
وہ جو آتے بھی، تو میں آپ سے باہر ہوتا!

ایک طویل نظم اعظم گڑھ کے کسی انگریز افسر کو خوش کرنے کو لکھی گئی۔ اس میں انگریزوں کی فتح کابل و قندھار کا حال ہے ؎

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں ۔۔۔ رایت و طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں ۔۔۔ شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں
حکمرانِ بحر و بر کی فتح ہے
قیصرِ ہندوستاں کی فتح ہے

شبلی کا ابتدائی اردو کلام معمولی ہے لیکن ان کے زمانے کے فارسی کلام میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو شاعر کی آیندہ عظمت کا پتہ دیتی ہیں یا جن سے اس زمانے کی جذباتی وارداتوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک دلچسپ نظم وہ ہے۔ جسے شبلی نے دیوان مرتب کرتے وقت قلمزد کر دیا لیکن جسے ان کے عقیدت مند شاگردوں نے برگِ گل میں شائع کیا ہے۔ اس میں غالباً کسی

خاص واقعہ کی طرف اشارہ اور کسی خاص شخص سے خطاب ہے ؎

اے پسر از چہ رمیدی از ما؟ ‏ باز گو تا کہ چہ دیدی از ما؟
گفتۂ ترکِ وفا یعنی چہ؟ ‏ بافتی نرد دغا یعنی چہ؟
گرچہ دُور از تو جہا دید ستم ‏ ہم بر آن عہد و موا عید ہستم
تو بیک دم زدن اے سرو رخسار ‏ گشتۂ چوں من از من بیزار
وقتہا بزم سخن ساختمے ‏ طرح بیت و غزل انداختمے
من بہ تو با دلِ ماتم زدہ ‏ خستۂ، سوختۂ، غم زدہ
بے حجابانہ ہم از سرِ ذوق ‏ عرض مے داشتمے حالتِ شوق

ہم تو پابندہ بجوشِ مستی[1]
عہد و پیمانِ وفا مے بستی!

اے چہرۂ نازکت گُلِ تر ‏ زلفِ سیہ تو سنبلِ تر
اے لعلِ تو سحر ساز کردہ ‏ چشمت درِ فتنہ باز کردہ
زود آے کہ آتشِ غم سوخت ‏ دیں شعلہ ز فرق تا قدم سوخت
دور از غمِ تو بہ آہ و زاری ‏ فریاد کنم ز بے قراری
در ہجرِ تو گاہ با دمِ سرد ‏ ایں تازہ غزل سرایم از درد

---

[1] غالباً یہ نظم، مولانا کے اس کلام میں تھی جو ان کے لڑکپن کے نہایت عزیز دوست اور شاگرد مولوی محمد سمیع کے پاس جمع تھا۔ شبلی ترتیب دیوان کے وقت، ۱۸۹۴ء کے ایک خط میں مولوی صاحب کو لکھتے ہیں۔ "فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمہارے پاس ہیں۔ نہایت جلد بھیج دو۔" مولانا شبلی سے مولوی محمد سمیع کے تعلقات پر سید سلیمان ندوی نے مکاتیب شبلی میں روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں۔ "مولانا سے ان (مولوی سمیع) کو نہایت محبت تھی بلکہ عشق تھا۔"

کاے رشکِ گل و سمن کجائی
وے تازہ بہارِ من کجائی

بے تو ہمہ شب نہ آیدم خواب
افسانۂ مرد و زن کجائی

شبلی بہ غمِ تو مے سراید
کاے راحتِ جان و تن کجائی!

ایک اور دلچسپ غزل انھوں نے اس وقت لکھی جب وہ ابھی تسنیم تخلص کرتے تھے۔ یہ غزل فقط دو تین گھنٹوں میں لکھی گئی اور اس سے ان کی قدرتِ شعر گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

نگاہے بر منِ مسکیں خدا را
کہ گاہے شاہ بنواز د گدا را

فغاں کز بہرِ تاب و صبر و آرام
غمت نگذاشت در دل ہیچ جا را

نہ یاد آری گہے از خستۂ خویش
فراموش ساختی حرفِ وفا را

سخن را رہ نباشد در دہانت
ز تنگی ہمچو در غنچہ صبا را

کجا در بارگاہش بار بخشند
چو تسنیم غریب بے نوا را

ایک اور پُر اثر غزل کسی زمانے میں اعظم گڑھ کو چھوڑتے وقت لکھی گئی ؎

تا نہ پنداری کہ خرّم می رویم
از وطن با چشمِ پُرنم مے رویم

از گدازِ شعلۂ غم ہمچو شمع
بزم ہا را کردہ برہم مے رویم

از فریبِ مارِ گیسوے کسے
زیں جہاں مانند آدم مے رویم

خفتہ پاسِ چند بر دامانِ گل
زیں گلستاں ہمچو شبنم مے رویم

شبلیا از گردشِ گردونِ دوں
دوستاں رفتند و ما ہم مے رویم

ان کے علاوہ شبلیؔ کے وہ اشعار بھی ذکر کے قابل ہیں جو اُنھوں نے ۱۸۷۷ء میں جنگ ترکی و روس کے موقع پر لکھے۔ اس لڑائی نے ہندوستان میں بڑا جوش پیدا کیا تھا اور ترکی کے لئے جا بجا چندہ ہوا۔ مولانا محمد قاسم سرپرست دارالعلوم دیوبند نے اس تحریک میں بڑا حصہ لیا۔ اس زمانے میں حکومت انگلشیہ روس کو اپنا حریف سمجھتی تھی۔ اس لئے سرکاری حلقوں میں بھی یہ کوششیں استحسان کی نظروں سے دیکھی گئیں۔ اس وقت مولانا شبلیؔ کی عمر کوئی اکیس سال کی تھی لیکن وہ اس لڑائی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اعظم گڑھ میں انھوں نے چندہ جمع کیا اور کوئی تین ہزار روپے ترکی کو بھیجے گئے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف میں فارسی اور اُردو قصیدے بھی لکھے جو شاعرانہ نقطۂ نظر سے بلند رتبہ نہ سہی لیکن جن سے مولانا کی ترکی سے اس محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو آگے چل کر بھڑک اُٹھی اور اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر اپنا نقش یادگار چھوڑ گئی۔

عنفوانِ شباب کے کلام میں جس چیز پر شبلیؔ نے سب سے زیادہ زورِ طبع صرف کیا ہے۔ وہ ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔ جس میں طرح طرح کے صنائع بدائع ہیں اور طرز بھی کسی قدر انوکھی ہے۔ اس میں اپنا دردِ دل بڑے پُر اثر طریقے سے بیان کیا ہے اور ان کی اس زمانے کی مزاجی کیفیت کا اس قصیدے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ بعض بند ہیں ؎

بنگر کہ چوں در ہر فنے، از دانہ کردم خرمنے ہم از گلے وز گلبنے، آراستم صد گلشنے
گردوں ندارد چوں منے، فضل و ہنر را مامنے اینک بفکر روشنے، شمیم در ہر انجمن
یا زم با بہی خواری نگر، در گریہ و زاری نگر حالِ تبہ کاری نگر، وز چرخ خوں خواری نگر

خویشِ دل آزاری نگر، وز بخت بد یاری نگر | ہموارہ خوں باری نگر، از چشم خوں بالائے من
دربکسی اکنوں ہمے، خوش کردہ ام کنج غمے | نے مونسے نے ہمدمے، تا رازِ دل گویم دمے
آوخ کہ سوز ماتمے، نگذاشت در چشم نمے | زخم دلم را مرہمے، نبود دریں بیت الحزن
بنگر کجا چندیں ہنر، از جور چرخ ہفت سر | چوں لالہ ام خوں شد جگر، زاسازیِ بختم نگر
کاندر چنیں حالے بتر، ہر دم دہد داغے دگر | از من کہ بگذارد خبر، در بزم آں شاہِ زمن

شبلی کے لئے یہ انتہائی کوفت اور کشمکش کا زمانہ تھا لیکن رات کی تنہائی تاریکی کے بعد صبحِ صادق کا ظہور ہوتا ہے۔ عین اس وقت، جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ مغرب کی طرف سے شعاعِ اُمید چمکی۔ شبلی نے اس کا تعاقب کیا اور وہ انھیں ایک ایسے راستے پر لے گئی جو انھیں ترقی اور شہرت کی انتہائی سربلندیوں پر پہنچانے والا تھا۔

۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی خالی ہوئی۔ شبلی نے بھی اس کے لئے عرضی دی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی سفارش ساتھ بھیجی۔ سر سید مولانا فیض الحسن سے عربی ادب کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے اور ان کا اتنا ادب کرتے تھے کہ جب وہ پنجاب کے سفر میں گئے اور ایک جلسے میں مولانا فیض الحسن نے کھڑے ہو کر اپنے نامور شاگرد کی تعریف میں ایک عربی قصیدہ پڑھنا چاہا تو سر سیّد نے ان کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا اور کہا کہ آپ کی یہ تحریر ویسے ہی میرے لئے دستارِ فضیلت ہے۔ میں آپ کو کھڑے ہو کر اس کے پڑھنے کی تکلیف نہیں دے سکتا!

شبلی نے ایک ایسے شخص کی سفارش بھیجی تھی۔ پھر سر سید بھی ان سے ناآشنا نہ تھے کیونکہ اس سے ڈیڑھ سال پہلے ان کا ایک عربی قصیدہ علی گڑھ

گزٹ میں چھپ چکا تھا۔ علم وفضل کے سارے جوہر ان میں موجود تھے۔ سرسیّد کے دستِ راست مولوی سمیع اللہ کی بھی ان کو امداد حاصل تھی۔ چنانچہ اس اسامی کے لئے ان کا انتخاب ہوا اور ۱۸۸۲ء کے آخر میں وہ علی گڑھ روانہ ہو گئے ؛

علی گڑھ

شبلی نے یکم فروری ۱۸۸۳ء سے علی گڑھ کالج میں کام شروع کیا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض اقربا اس تعلق کے خلاف تھے۔ بالخصوص ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ جم کر وکالت کریں لیکن مولانا تو پندرہ روپے کی فرق اپنی کو وکالت پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ وہ علی گڑھ جانے کے بعد ایک خط میں اپنے چچا کو لکھتے ہیں :—

والد قبلہ را جز بہ وکالت روئے و راہے نیست۔ و این آزادہ دلی اگر بہ وکالت نہ ساختہ باشم۔ در نظرِ انصاف مرا درین میانہ گناہے نخواہد بود۔

اس کے علاوہ اگرچہ وہ علی گڑھ کے چالیس روپوں کو اپنے اور اپنے خاندان کے رتبے سے فروتر سمجھتے تھے لیکن انھیں اُمید تھی کہ یہ تعلق ان کی آئندہ عظمت کا پیش خیمہ ہوگا۔ فرماتے ہیں :—

ایں جا کہ آرمیدہ ام و ایں مذلت برخویش پسندیدہ۔ ندانم کہ تا چرخ را درپردہ چہ نیرنگہاست۔

فی الواقع ان کا اپنے والد سے اس معاملے میں اختلاف بجا تھا۔ ان کی اپنی ذہانت اور محنت اور ان کے والد کے اثر و رسوخ سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر وہ وکالت میں ثبات و استقلال سے کام لیتے تو بالآخر ان کی وکالت چل نکلتی لیکن پھر بھی کیا ہوتا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنے والد کی طرح ایک کامیاب وکیل ہو جاتے لیکن آج اُن کے والد کو لوگ کیوں جانتے ہیں؟

صرف شبلی کے انتساب کی وجہ سے۔ شبلی نے اپنے آپ کو علمی زندگی کے لئے وقف کر کے زیادہ روپیہ نہ کمایا ہو لیکن انھوں نے وہ سربلندیاں حاصل کیں جو ان کے والد کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔

پھر علی گڑھ کی ملازمت کو فقط سیم و زر کے ترازو میں تولنا صحیح نہیں۔ علی گڑھ میں شبلی کی زندگی کا دوسرا طالب علمانہ دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اُنھوں نے وہ چیزیں سیکھیں جو انھیں ایک عام معقولی عالم سے ممتاز کرتی ہیں اور ان کی علمی سربلندی کا ذریعہ بنیں۔

جس وقت شبلی علی گڑھ پہنچے۔ اس وقت وہ ایک ذہین، اولوالعزم، محنتی، فارغ التحصیل طالب علم تھے۔ ارادوں میں بلندی تھی۔ مذہب سے گہری دلچسپی اور علم و فن سے سچا عشق تھا۔ ان کی نظم و نثر سے شعری اور ادبیانہ خوبیاں عیاں تھیں لیکن ان کمالات کا غلط استعمال ہو رہا تھا۔ ان کی شاعری عشقیہ غزلوں کے لئے وقف تھی اور مذہبی اور علمی جوش کا سارا اظہار غیر مقلدوں سے مناظرہ بازی میں ہوتا تھا۔ علی گڑھ جا کر یہ سب کچھ بدل گیا۔ عشقیہ شاعری کی جگہ قومی شاعری نے لے لی اور جو جوشِ طبیعت اور احساسِ مذہبی، فرقہ اہلِ حدیث کی "تردید بلکہ تعذیب" میں صرف ہو رہا تھا وہ غیر مسلموں اور اسلام کے دشمنوں کے لئے وقف ہو گیا۔

لیکن قیامِ علی گڑھ سے فقط یہی نہیں ہوا کہ شبلی کی صلاحیتوں کے استعمال کا رُخ بدل گیا اور وہ اس سراب سے بچ گئے جس میں ہمارے بڑے قابل اور پُرجوش علما کی علمی زندگیاں تباہ ہوئی تھیں بلکہ جو علوم، یعنی تاریخ و سیر، شبلی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ وہ اُنھوں نے غازی پور یا لاہور یا سہارنپور نہیں، بلکہ پہلی مرتبہ علی گڑھ میں سیکھے!!

خصوص آرنلڈ ہیں۔

اور سرسید نے شبلی کی علمی زندگی پر جو اثر چھوڑا۔ وہ ان کے لئے مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے اثر سے کم اہم نہ تھا۔

آرنلڈ کی نسبت خود مولانا شبلی کا بیان ہے ؎

آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم اُستاد مرا

مولانا حبیب الرحمٰن شروانی لکھتے ہیں :۔

"بڑی خوش قسمتی علامۂ شبلی کی یہ تھی کہ اُس عہد میں پروفیسر آرنلڈ ایسا علم دوست اُستاد کالج میں موجود تھا۔ یہ دونوں دلدادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللّون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامۂ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامۂ شبلی کی صداقت اور قوتِ دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا جو اصول عمدہ تھے۔ ان کو اخذ کیا نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا...... علامۂ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی......

پروفیسر آرنلڈ سالہا سال محمڈن کالج میں رہے..... وہ دوست شفیق اور شفقت کے اثر سے شاگردوں کے دل میں گھر کرنے والے تھے اس پر بھی ان کے کسی شاگرد نے ان سے وہ فیض حاصل نہیں کیا جو علامۂ شبلی کے حصہ میں آیا۔"

مولوی اقبال احمد سہیل بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اس کی تائید میں

فرماتے ہیں :۔

"مولانا شروانی کا یہ ارشاد یقیناً صحیح ہے کہ آرنلڈ صاحب سے اور کسی شخص نے علی گڑھ میں اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جس قدر علامہ موصوف نے اور ظاہر ہے۔ کہ اُٹھا بھی نہ سکتے تھے کیونکہ اب تو مسلسل تجربات نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ انگریزی درسگاہوں میں نہ وہ قوتِ مطالعہ اور صلاحیتِ اخذ پیدا ہوتی ہے۔ نہ اُستاد کی شخصیت سے وہ شغف اور شیفتگی جو عربی مکاتیب کا مخصوص جوہر تھا"

شبلی اور آرنلڈ کے درمیان بڑے خوشگوار علمی تعلقات تھے لیکن قیامِ علی گڑھ میں شبلی پر جتنا اثر سرسید کا ہوا کسی اور کا نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ شبلی کی ذہنی اور علمی ساخت میں (ان کی طبعی صلاحیتوں کو چھوڑ کر) سب سے زیادہ ہاتھ دو شخصوں کا تھا۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کا اور سرسید کا۔ شبلی مولانا چریا کوٹی کے زیر اثر اس زمانے میں رہے۔ جب ذہنِ انسانی ایک لوحِ سادہ کی طرح اثر پذیر ہوتا ہے۔ اس لئے مولانا محمد فاروق کا اثر سب سے دیرپا ثابت ہوا۔ پھر ایک زمانے میں شبلی سرسید کے رنگ میں رنگ گئے۔ یہ رنگ آخیر عمر میں دُھلنا شروع ہو گیا لیکن اگر عطیہ فطرت کو نظر انداز کر دیں تو واقعہ یہ ہے کہ شبلی کو شبلی دو شخصوں نے بنایا۔ سرسید نے اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی نے!!

سید سلیمان ندوی، جن کے خیال میں شبلی کی بڑائی اسی میں ہے کہ اس کے محسنوں کو نیچا دکھایا جائے۔ حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں کہ اگر علی گڑھ نے شبلی کو شبلی بنا دیا تو کیا وجہ ہے کہ اس بزم میں آکر کسی اور کا قدو قامت نہیں بڑھا۔ فی الحقیقت سید صاحب کا طنز بیجا نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے

ہیں۔ شبلی علی گڑھ میں فقط جوہرِ قابل ہی نہیں بلکہ ایک حد تک اور ایک خاص رنگ میں، تربیت یافتہ جوہر لے کر آئے تھے۔ لیکن کاش سید سلیمان یہ بھی بتائیں کہ شبلی کے علاوہ اور کون تھا جسے اتنی مدت تک اور اتنے قرب و یگانگت سے علی گڑھ کے پیرِ میکدہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا؟

شبلی تقریباً سولہ سال تک علی گڑھ رہے۔ اس طویل مدت انھیں، اسلامی ہندوستان کی سب سے مقتدر، زندہ ہستی سے روزانہ صحبت اور اخذِ فیض کے جو مواقع میسر آتے تھے۔ ان کا بیان شبلی کے ایک پرانے دوست کی زبانی سُنیے۔ مولانا عبدالحلیم شرر، شبلی کے ان وفادار دوستوں میں سے تھے جو ندوہ کی سورش میں بھی شبلی کے ہم خیال رہے۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

علی گڑھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی۔ ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سیّد صاحب نے ان سے ربط ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلاناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ اس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ بتکلف کھانا کھانے اور شریکِ صحبت رہنے کا موقع ملا۔

شبلی نے بھی ایک خط میں، جو علی گڑھ کی ملازمت کے سات ماہ بعد اس زمانے میں لکھا گیا۔ جب سرسید نے ابھی انھیں اپنے پاس نہیں بلایا تھا۔ سرسیّد کے کتب خانے کا ذکر کیا ہے :۔

میں جس حالت میں ہوں۔ اچھا ہوں۔ سیّد صاحب نے اپنے کتب خانہ

کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عرب کی چند ایسی کتابیں ہیں۔ جن کو میں کیا، بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔ مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں۔

گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے۔ میرے مطالعہ میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب شبلی سرسید کے قریب آگئے تو انھوں نے اپنا کتب خانہ ہی انھیں سونپ دیا اور یہ سلسلہ سرسید کی موت تک قائم رہا۔ مولوی امجد علی اشہری حیاتِ انیس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے مشہور بانی سرسید احمد خاں کا انتقال ہوا۔ راقم کو نواب محسن الملک کی خدمت میں علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا جو سرسید کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی کے عالیشان کمرے میں سرسید کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب کے سپرد تھا"

لیکن سرسید کے ہاں فقط شبلی کو وہ کتابیں ہی پڑھنے کو نہ ملیں جن کا شبلی نے ابھی تک نام نہ سنا تھا بلکہ سرسید نے شبلی کی اس علم میں راہنمائی کی جو آج ان کا تاجِ فضیلت ہے یعنی علمِ تاریخ و سیرت نگاری۔ سرسید کو تاریخ اور آثارِ اسلامی سے، شروع سے غیر معمولی شغف تھا۔ ان کی آثار الصنادید قدیم مذاقِ تحریر کے باوجود آج بھی مورخ کے لئے واقعات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اسلامی ہندوستان کی تین اہم تاریخی کتابیں آئین اکبری۔ توزکِ جہانگیری اور ضیاءالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی سرسید نے اشاعت کے لئے مرتب کیں۔ ان میں سے تیسری بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی نے چھپوائی اور باقی دو انھوں

نے اپنے خرچ سے شائع کیں۔ اسلامی تاریخ سے یہ شغف تھا جو شبلی نے سرسید سے حاصل کیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر جو شبلی اور سرسید کی ابتدائی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے شبلی کی مثنوی صبح امید کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :۔

"اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے[۱] وہ تاریخی تنقید و تحقیق میں مصروف

---

[۱] یہ تو ایک عینی شاہد کا بیان ہے لیکن سید سلیمان نے حیاتِ شبلی میں یہ مسلسل کوشش کی ہے کہ شبلی پر سرسید کا جو اثر و فیض تھا۔ اس کے بارے اُسے اپنے کمالِ انشا پردازی سے سبکدوش کر دیں۔ شبلی کے تاریخی مذاق کی نسبت ان کا قیاس ہے کہ یہ ڈاکٹر لائٹز کی سنین اسلام کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سلیمان صاحب کے پاس' اس خیال کی تائید میں ایک بھی شہادت نہیں۔ ان کا سارا اندراج قیاس پر مبنی ہے اور وہ بھی قیاسِ بیجا پر۔ مثلاً سنین اسلام کی نسبت وہ لکھتے ہیں "غالباً مولانا کو یہ کتاب ان کے لاہور ہی کے زمانۂ قیام میں ہاتھ آئی تھی"۔ حالانکہ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ کتاب ۱۸۷۶ء میں لکھی گئی۔ مکاتیب شبلی کے مطابق شبلی ۱۲۸۹ھ یعنی ۱۸۷۲ء میں لاہور میں قیام پذیر تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں فالتو کتابوں کے لئے شبلی کے پاس جو روپے کی فراوانی تھی۔ اس کا اندازہ بھی شبلی کے خطوط سے ہو سکتا ہے (۲) اسی طرح سید سلیمان' سنین اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "۱۸۸۳ء میں مولانا نے جو فارسی عیدیہ قصیدہ لکھا تھا۔ اس میں تاریخ اسلام کے بعض ممتاز شہروں اور نامور خاندانوں کے حوالے ہیں"۔ لیکن اس کا ذرہ بھر ثبوت نہیں کہ شبلی نے یہ حوالے سنین اسلام سے لئے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فارسی قصیدہ میں جتنے غیر متعارف نام آتے ہیں سب مسدس حالی میں موجود ہیں اور جو اس میں نہیں۔
(باقی صفحہ آئندہ پر)

تھے جس کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ان کا لکچر تھا جسے انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔

مولوی اقبال احمد سہیل بھی اس سلسلے میں لکھتے ہیں :۔

دوسرا اور غالباً سب سے بڑا احسان علی گڑھ کا یہ تھا کہ مولانا کا موضوع تصنیف بدل گیا۔ اگر اسی قدیم ماحول میں رہتے تو درسیات کے شروح و حواشی یا فروعیاتِ فقہی کے تنگ دائرہ سے نکلنا شاید نصیب نہ ہوتا۔ یہاں آئے تو تاریخِ اسلامی کے ناپیدا کنار میدان میں تگ و دو کا ولولہ پیدا ہوا۔

شبلی کو قومی تاریخ سے روشناس کرنے، اس ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے اور ان سے قومی تاریخ پر کتابیں لکھوانے کے علاوہ سرسید نے یہ کیا کہ شبلی کے موضوعِ شعر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :۔

بہر حال علی گڑھ تحریک کے بعض اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا ان کے وہ رنگین ترانے جواب تک حسن و عشق کی جھوٹی (۹) کہانیوں سے لبریز ہوتے تھے۔ اب قوم و ملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) وہ سنینِ اسلام میں بھی نہیں (۳) کاش سلیمان صاحب، سنین اسلام کو ہی بہ نظرِ غور دیکھتے اور یہ فیصلہ کرتے کہ کیا اس ناموں کی کھتونی اور رخا ندانوں کی فہرست سے ایک نئے علم کا شوق پیدا ہو سکتا ہے؟

بن گیا۔

شبلی پر کالج اور سرسید کے جو علمی احسانات تھے۔ انھیں شبلی نے ۱۸۹۴ء کی ایک تقریر[1] میں تفصیل سے بیان کیا تھا۔ فرماتے ہیں :—

"حضرات! یہ سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پاسکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشوونما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے۔ اس کالج سے ہوا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کا کیا مقصد تھا۔ آپ کے مذہبی جھگڑے [بڑھانا] مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو قوت اور استحکام دینا!

میں آج سے بہت پہلے فارسی شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ کس قسم اور کس درجہ کے تھے؟ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو اعلیٰ رتبہ کی خیال کرتا ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج کی میری شاعری اگر پست ہے تو اس وقت پست تر تھی۔ غرض یہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے۔ وہ اسی کالج کی بدولت ہے۔ اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں۔ اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں! ...

آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ یہ کالج صرف طالب علموں اور اسٹوڈینٹس کو

---

[1] یہ تقریر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپی تھی۔ ہم نے اس کا اقتباس مولوی محمد امین زبیری کے ایک مضمون سے نقل کیا ہے۔

علمی ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کی علمی اور روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالب علموں کو بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتا ہے تو وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلما کر سکتا ہے"۔۔۔۔۔

اس کے بعد ان اہل کمال (مثلاً سید محمود۔ حالی۔ نواب محسن الملک) کا ذکر کر کے، جو کالج کے احاطہ میں موجود تھے۔ مولانا شبلی نے (سر سید کے متعلق) فرمایا:۔

"حضرات میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہے۔ اس میں ایک نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک جب اس کالج کا یا کالج کے متعلق جس چیز یا جس شخص کا نام لیا جائے۔ اس میں اسی بڑے شخص کا جلوہ موجود ہے ع

جدھر دیکھتا ہوں، اُدھر تو ہی تو ہے!"

لیکن سر سید نے فقط شبلی کی علم و ادب کے نئے کوچوں میں راہنمائی نہیں کی وہ ان کے سچے محب اور پرجوش معاون تھے۔ شبلی اور سر سید کے ابتدائی خطوط سے خیال آتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان وہی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ جو ایک شفیق باپ اور ایک ہونہار بیٹے میں ہوتا ہے۔ شبلی کی عمر اس وقت پچیس سال تھی اور سر سید کی ساٹھ سے بھی زیادہ۔ عمر میں وہ شاید شبلی کے والد سے بھی بڑے تھے۔ اس کے علاوہ سر سید کو تو قوم کا ہر قابل فرد عزیز تھا۔ انھیں خاص علی گڑھ کالج کا ایک جوہر قابل کیوں نہ عزیز ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے اس نو وارد نوجوان سے وہی سلوک کیا جو ایک شفیق باپ ایک عزیز بیٹے سے کرتا ہے۔ شروع میں شبلی شہر میں رہتے تھے اور ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ سواری میں اٹھ جاتا تھا۔ سر سید نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے میں

مکان دیا۔ ایک وقت کے کھانے پر وہ عام طور شریک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید ان کی صحت، ان کی ناموری اور ان کے مفاد کا پورا خیال رکھتے تھے۔ وہ ۱۸۸۷ء میں بہت علیل ہوئے تو سرسید کے بیٹے سید حامد نے، جو ان دنوں دہلی میں مامور تھے۔ تحریک کی کہ وہ دہلی آئیں اور وہاں کے ممتاز اطبا سے علاج کرائیں۔ پھر سرسید انھیں اپنے ہمراہ نینی تال لے گئے۔ ۱۸۸۹ء میں انھوں نے دوسری جگہوں کے علاوہ نواب عماد الملک کو شبلی کا گزشتہ تعلیم پر لیکچر بھیجا اور ساتھ ہی خانگی خط میں اس کی تعریف[1] کی۔ جب عماد الملک نے اس کے جواب میں ایک تعریفی فقرہ لکھا تو شبلی کو نواب صاحب سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی [شاید یہ خیال ہو کر حیدرآباد سے نواب صاحب کی وساطت سے اس طرح کا تصنیفی وظیفہ مل جائے۔ جو ۱۸۸۶ء میں مولانا حالی کو بصیغۂ امداد مصنفین مل چکا تھا اور جس طرح حالی نے اس وظیفہ کے بعد ترک ملازمت کر کے اپنے تئیں ہمہ تن علمی و ادبی کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ بھی کر سکیں] چنانچہ سرسید ۱۸۹۱ء میں شبلی کو اپنے ساتھ حیدرآباد محض اس لئے لے گئے کہ انھیں عماد الملک سے ملائیں[1] اور اس طرح شبلی کے نواب عماد الملک اور ان کے بھائی سید علی بلگرامی سے ان تعلقات کا آغاز ہوا جن کی بدولت، چار پانچ سال بعد شبلی کو سید علی بلگرامی کے صیغہ سے سو روپیہ کا تصنیفی وظیفہ حاصل ہوا۔ اور علی گڑھ چھوڑنے کے بعد حیدرآباد میں معقول ملازمت ملی۔

---

[1] سرسید نواب عماد الملک کو لکھتے ہیں: ”اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدرآباد لاؤں گا تاکہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ آپ کون ہیں اور کیسے ہیں۔“

اس کے علاوہ ۱۸۹۴ء میں سرسید نے خاص چٹھی لکھ کر گورنمنٹ میں سفارش کی کہ مولانا شبلی کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے۔ چنانچہ اس تحریک پر سینتیس ۳۷ سال کی عمر میں مولانا کو یہ خطاب عطا ہوا۔

مولانا بھی ان احسانات اور علی گڑھ تحریک کے نیک اثرات کے دل سے قائل تھے اور اس تحریک میں دل وجان سے شریک ہوئے۔ ان کے پاس دینے کو بہت دھن نہ تھا لیکن انھوں نے زبان اور قلم سے کالج کی بڑی خدمت کی۔ ان کے بعض کام تو ایسے تھے جو ایک دارے کے ملازم کو لوازمِ ملازمت سمجھ کر کرنے پڑتے ہیں۔ (مثلاً علی گڑھ یونین میں ان کی تقریریں یا علی گڑھ میگزین کی ادارت)۔ لیکن انھوں نے بہت سے دوسرے کام اپنے شوق سے ہاتھ میں لئے اور کالج کی عزت اور شہرت کا سبب بنے۔ سرسید کے تو وہ ادبی معاون تھے اور قرین قیاس ہے کہ ان کی تفسیر میں، جس پر ان کی توجہ ان دنوں مبذول تھی۔ شبلی نے ان کا ہاتھ بٹایا[1] ہوگا۔ اس زمانے کی

---

[1] مولانا اقبال احمد سہیل سیرتِ شبلی میں لکھتے ہیں۔ "سرسید نے اپنی تفسیر میں جو جدت طرازیاں کی ہیں وہ خود ان کے دل ودماغ کی پیداوار نہ تھیں بلکہ ان کا بیشتر حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت اللہ رسول چریا کوٹی مرحوم کے خرمنِ کمال سے مستعار تھا۔" مولانا عنایت رسول سے سرسید نے جن دو ایک مباحث میں مدد لی تھی۔ اس کا انھوں نے بالوضاحت ذکر کر دیا ہے لیکن چونکہ شبلی اور سرسید کا تالیفِ تفسیر کے دوران میں دن رات کا ساتھ تھا اور شبلی کے عقائد بھی (جیسا کہ ان کی بعد کی تصانیف مثلاً الکلام۔ علم الکلام سے صاف نظر آتا ہے)۔ سرسید سے ملتے جلتے تھے۔ اس لئے قرینِ قیاس ہے کہ تفسیر کی تالیف کے دوران میں اکثر دونوں میں تفسیری مباحث

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اکثر تصنیفین شبلی نے کالج کو ہبہ کردیں اور ان کی مالی اشاعت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔

شبلی فارسی اور عربی کے پروفیسر تھے لیکن سرسید نے کلام مجید کا درس ان کے سپرد کر رکھا تھا اور اُنھوں نے کالج میں ایک مذہبی فضا قائم کرنے میں سرسید اور سید محمود اور کالج کے نیک خیال طلبا کی بڑی مدد کی۔ ان کا ۱۸۸۶ء کا ایک خط پڑھیئے:۔

"اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھیے نہ کوئی اور واقعہ۔ آپ سُنئے اور میں دل سے اُٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سُناؤں۔ یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے۔ جس کو انجمن الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی۔ اے سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوان لوگوں کو اس پُراثر فقرے سے چونکا دیتا ہے۔ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے۔ بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔

مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان وشوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں۔ آمین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) گفتگو ہوئی ہوگی اور اگر سرسید کی تفسیر میں مصنف کے سوا کسی اور کا ہاتھ ہے تو وہ مولانا فاروق کے بھائی کا نہیں بلکہ ان کے جانِ اُستاد شاگرد شبلی کا ہے۔

رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے۔ وہ مہتمم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ خود دیں گے۔ میں نے بھی ۵۰ دئے ہیں۔ سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے۔ لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ ہے۔

مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوشِ مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔

اس جوشِ مسرت میں اور بھی لکھتا مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحاق و عثمان یاد آگئے اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔

ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے۔ حالانکہ لیاقت بھی کچھ دنیا سے نرالی نہیں۔ خیر خدا توفیق دے۔"

علی گڑھ کالج سے شبلی کی محبت اور سرسید سے ان کی عقیدت کا سب سے بااثر اظہار مثنوی صبح امید میں ہوا ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی اور فنی نقطۂ نظر سے اردو کی بہترین طویل نظموں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اس کی نسبت جدید اردو شاعری کے مصنف نے بالکل بجا کہا ہے کہ "اس میں سرسید احمد خاں کا جیسا پاکیزہ کردار شبلی نے اشاروں اشاروں میں کھینچ دیا ہے وہ حالی کی حیاتِ جاوید سے بھی نہ ہو سکا۔" اس نظم میں شاعر نے "پیرِ دیرین" (سرسید) کی چار شعروں میں ایک نہایت دل نشین تصویر کھینچی ہے اور اس کے بعد قوم نے سرسید کی جو قدر نہ کی اور سرسید نے

س کا جو جواب دیا۔ اس کا بیان ہے۔

کیا کیا نہ مصیبتیں اُٹھائیں　　ہر طرح کی ذلتیں اُٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر!　　دشنام سُنی دعائیں دے کر!
حنظل پائے شکر کے بدلے!　　سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے!
لعل اس نے دیے شرار پائے!　　گل نذر کیے تو خار پائے!
کیا تلخ ملے جواب اس کو!　　کیا کیا نہ دیئے خطاب اُس کو!
برگشتہ کہا کسی نے دیں سے!　　لعنت کا صلا ملا کہیں سے
خود قوم کو ہو گئی تھی یہ کد　　زندیق کہا۔ کسی نے مُرتد!
چرچے تھے یہی زغرب تا شرق　　وہ اپنی ہی دُھن میں تھا مگر غرق
گو ناوکِ ظلم کا ہدف تھا　　وہ شیفتہ پھر بھی سر بکف تھا
منظور جو قوم کا تھا اعزاز　　ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
دشنام کو وہ دُعا ہی سمجھا!　　وہ درد کو بھی دوا ہی سمجھا
جور اس نے سہے کرم کے بدلے!　　لطف اس نے کیے ستم کے بدلے!

سرسید کی کوششوں سے قوم میں جو ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ ا
کا بیان بھی بڑا پُراثر ہے ؎

باتوں میں اثر تھا کس بلا کا　　اک بار جو رُخ پھرا ہوا کا
اُمید کی بڑھ گئی تگ و تاز　　اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے　　ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پا بگِل تھے　　آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا　　مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے　　اخبار کہیں۔ کہیں رسالے

تعلیم کے جا بجا وہ جلسے　　گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بیتاب ہر ایک جزو کل تھا　　ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

اس کے علاوہ ان کی وہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں جو انھوں نے مشہور ہستیوں کی آمد پر کالج کے جلسوں میں پڑھیں اور جن میں معزز مہمانوں کی تعریف کے علاوہ کالج اور علی گڑھ تحریک کا بیان ہے۔ شبلی بڑے حساس اور خوددار انسان تھے بلکہ بعض اوقات تو ان کا عزتِ نفس کا شدید احساس اس طرح بڑھ جاتا کہ وہ خودداری (SELF RESPECT) اور زود حسی (SENSITIVENESS) میں تمیز نہ کر سکتے۔ انھیں دوسروں کی مدح سخت ناپسند تھی۔ اس لئے انھوں نے ان مدحیہ نظموں اور قصیدوں کو اپنے دیوان میں جگہ نہیں دی۔ لیکن سید سلیمان ندوی نے بعض قصائد کو اپنی کتاب کے حاشیے پر نقل کیا ہے۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں کالج پر شبلی کو کس قدر ناز تھا اور ان کا جوش و ولولہ کس طرح اشعار میں اُبلا پڑتا تھا!

۱۸۹۵ء میں انھوں نے نواب وقار الامرا کی آمد پر ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

صاحبا گوش بہ من دار کہ تا شرح دہم　　آنچہ بر ما زسیہ کاریِ دوراں گذرد
بود روزے کہ گراں پایگیِ رتبۂ ما　　بیش ازاں بود کہ در وہم سخنداں گذرد
حالیا کار بآں بے سروپائی بکشید　　کہ بما ہر کہ رسد بر زدہ داماں گذرد
بگذرد از غم و آزار پیاپے بر ما　　آنچہ بر شیشۂ نازک ز افتادنِ سنداں گذرد
ہر چہ از بیکسی و ذلت و خواری بینی　　خود عیاں است و بہ سرِ آنکہ بہ پنہاں گذرد
گر نہ ایں مکتب و ایں مدرسہ برپا می گشت　　بیم آں بود کہ ایں درد ز درماں گذرد

این مسیحا نہ اگر بہر مداوا می خاست
بیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد

ان نظموں، دوسری تصانیف اور علی گڑھ کی ملازمت کی وجہ سے شبلی کا شمار سرسید کی فوج کے نامی پہلوانوں میں سے ہونے لگا اور بعض لوگ انھیں اب بھی اسی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا۔ جب شبلی نے علی گڑھ اور سرسید کی پالیسی کے خلاف ایک محاذ قائم کیا اور اُس ردِّ عمل کو مستحکم کیا جو علی گڑھ تحریک کے خلاف اسلامی ہندوستان میں جاری ہوا۔

بظاہر تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر شبلی کی ابتدائی نشوونما اور ان کی طبیعت کا دھیان رکھیں تو اس قدر غیر متوقع نہیں۔ شبلی کی تمام تعلیم قدیم اسلوب کے ماتحت ہوئی تھی۔ ان کے اساتذہ میں سے جس شخص نے سب سے زیادہ ان پر اپنی شخصیت کا نقش یادگار چھوڑا مولانا محمد فاروق چریاکوٹی تھے۔ جو بقول مولوی اقبال احمد سہیل "تحریک جدید کے بڑے مخالفوں میں سے تھے"۔ شبلی کے باقی سب بھائیوں نے کالجوں میں تعلیم پائی اور وہ اپنے گھر میں جدید کے خلاف قدیم کے ترجمان تھے۔ جب انھیں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے معمولی ملازمتیں بھی نہ ملیں تو انگریزی تعلیم کے خلاف غم و غصہ اور بڑھ گیا۔ ہم ان کا وہ فارسی خط نقل کر چکے ہیں جس میں انھوں نے جل کر عزیزوں کے انگریزی خوانی کے مشورے کو غیر ضروری قرار دیا ہے۔ اور وہ ہیچ کے مضامین اور اکبر کی نظموں نے ان کے خیالات کو اور مضبوط کر دیا۔ چنانچہ جب وہ علی گڑھ کالج میں آئے تو اگرچہ وہ سرسید کے مدح خواں اور ان کی قومی بہی خواہی کے قدرداں تھے لیکن وہ انگریزی اور جدید تعلیم سے

بھی متنفر تھے۔ جس سال وہ علی گڑھ آئے ہیں۔ اسی سال کا ایک خط ہے:۔

"یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو۔ خیالات کی وسعت سچی آزادی بلند ہمتی۔ ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔ اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لاحول ولا........ وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔

اس خط میں شبلی نے انگریزی خوانوں کی جو شکایت کی ہے وہ بیجا نہیں لیکن پہلا فقرہ بھی غور طلب ہے۔ "یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے"۔ یعنی یہ خیالات یہاں آکر پیدا نہیں ہوئے۔ انھیں شبلی اپنے ساتھ ہی لائے تھے لیکن یہاں پہنچ کر وہ اور مضبوط ہو گئے!!

اس کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی ہوئی۔ علی گڑھ کے قیام کے بعد ان کی یہ رائے ہو گئی کہ قدیم مدارس میں فقہ منطق۔ صرف و نحو کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی شامل کیا جائے لیکن اس سے مقصود قدیم کو جدید بنانا نہ تھا بلکہ فقط قدیم کو مضبوط کرنا تھا۔ شبلی کو دلی الفت قدیم کے ساتھ تھی اور جب کبھی انھیں مشرقی علوم یا قدیم طریقۂ تعلیم پر فخر کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ خوشی سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں اٹلی میں مستشرقین کی کانفرنس

گورنمنٹ نے مولوی سمیع اللہ خاں کے بیٹے مولوی حمید اللہ خاں کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ وہ مجلس مذکور کے لئے کوئی مضمون نہیں لکھ سکتے۔ سرسید کو لکھا کہ وہ علی گڑھ کے علما سے کچھ لکھوا بھیجیں اس پر شبلی اپنے چچا کو لکھتے ہیں: ۔

"آپ دیکھیں کہ عربیت اب بھی موجب شہرت و عزت ہے۔ اگر آج حمید اللہ خاں عربی سے واقف ہوتے تو نہ صرف لندن بلکہ تمام یورپ میں ان کی ناموری کا پھریرا اُڑ جاتا۔"

اس کے علاوہ حالات کچھ ایسے تھے کہ کالج میں شبلی کا قدیم سے گہرا لگاؤ ناگزیر تھا۔ وہ کالج میں قدیم علوم اور السنۂ شرقیہ کے اُستاد تھے اور ان علوم کے اساتذہ کے ساتھ انگریزی کالجوں میں عام طور پر وہی سلوک ہوتا ہے جو ایک سوتیلی ماں سوکن کی اولاد کے ساتھ کرتی ہے۔ ان کی تنخواہیں انگریزی اور جدید علوم مثلاً سائنس کے اساتذہ سے قلیل ہوتی ہیں اور قدر و مرتبہ بھی اسی تناسب سے۔ اس صورتِ حالات کے لئے خواہ کون سے اقتصادی اسباب بتائے جائیں [اور ہم تو ان سب کے باوجود اس صورتِ حالات کو تعلیمی اور قومی نقطۂ نظر سے سخت مضر سمجھتے ہیں] لیکن اس کا یہ نتیجہ تو لازمی ہے کہ قدیم علوم کے اساتذہ کے لئے نظر کی پھانس کا بڑا سامان ہوتا رہے۔ اور اگر ان سے کوئی غیر معمولی طور پر حساس ہو تو اس کے لئے زندگی دوبھر ہو جائے۔ شبلی کی حالت السنۂ شرقیہ کے عام اساتذہ سے کہیں بہتر تھی۔ وہ سرسید کے رفیق کار تھے اور سرسید ان کا بڑا پاس کرتے تھے لیکن شبلی ٹھاکر شیوراج سنگھ کی نسل سے تھے۔ ان کی ذکاوتِ حس حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور وہ خیالی یا حقیقی بے وقعتی سے بہت جلد برہم ہو جاتے۔ سید سلیمان نے ان کی زود رنجی کا ایک واقعہ اس زمانے کا نقل کیا ہے جب وہ کالج میں ابھی بالکل نئے نئے آئے تھے۔

اور نہایت قلیل تنخواہ پاتے تھے۔ اس زمانے میں کالج میں کوئی تقریب تھی۔ جس میں سب اساتذہ شریک تھے۔ تعلیمی اداروں میں ہر استاد اپنے شعبے کو باقی سب سے اہم سمجھتا ہے۔ اس لئے ایسے موقعوں پر عموماً تنخواہ کے لحاظ سے کرسیاں بچھائی جاتی ہیں۔ اس موقع پر بھی یہی ہوا اور چونکہ شبلی تنخواہ میں سب سے نیچے تھے۔ ان کی کرسی بھی سب سے پیچھے آئی۔ شبلی پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مگر آنکھوں میں آنسو بھر آئے!

ایک اس قدر زود حس انسان کے لئے کالج کا قیام جس آرام و آسائش کا سبب ہو سکتا ہے۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس کے علاوہ بدقسمتی سے شبلی طلبا میں بھی خاص طور پر ہر دلعزیز نہ تھے۔ خواجہ غلام الثقلین لکھتے ہیں:۔

علی گڑھ کے طلبا میں مولانا شبلی عموماً غیر ہر دلعزیز تھے۔ ان کو طلبا خشک اور مغرور سمجھتے تھے ...... اُن کے ملنے والوں کا دائرہ بہت محدود رہتا تھا۔

ان حالات نے انھیں اور بھی زود رنج اور ذکی الحس بنا دیا تھا اور اب یہ حالت تھی کہ اگر نئے تعلیم یافتہ خیرخواہی سے بھی پرانی تعلیم کی نسبت کچھ کہتے۔ تو شبلی اسے استہزا اور شماتت سمجھتے۔ وہ سفرنامہ روم و مصر و شام میں لکھتے ہیں:۔

ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج و افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے۔

اس کے علاوہ جب وہ سرسید اور سید محمود سے طریق تعلیم کی نسبت بحثیں کرتے تو قدیم تعلیم کی نسبت ان کے خیالات اور زیادہ مستحکم ہو جاتے۔ سرسید اسلامی ہندوستان میں جدید تعلیم کے بانی تھے لیکن جدید تعلیم مقصود بالذات نہ تھی۔ اس کا مقصد قومی تنزل کو روکنا تھا اور جب کبھی سرسید کو جدید تعلیم

کے نتائج سے مایوسی ہوتی تو وہ ایک صاف دل انسان کی طرح اس کے اظہار سے گریز نہ کرتے۔ شبلی کے ایک نہایت ابتدائی خط میں سرسید کی اس مایوسی کا ذکر ہے۔ جو انھوں نے خود شبلی سے انگریزی تعلیم کے نتائج کے متعلق ظاہر کی۔ بعد میں یہ احساس اور بڑھتا گیا اور سرسید نے کئی جگہ اس کا اظہار کیا۔ مثلاً نواب وقار الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید ہے وہ شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔

اسی طرح سید محمود کا حال تھا۔ شبلی ان کی نسبت لکھتے ہیں :-

یہاں میں نے مجلسِ مباحثہ میں اس بات پر لکچر دیا کہ ہمارا گذشتہ طرزِ تعلیم موجودہ طرزِ تعلیم سے عمدہ تھا اور لطف یہ کہ عموماً طلبا نے میرا ساتھ دیا اور ...... سید محمود بالکل مجھ سے موافق تھے۔

رفتہ رفتہ شبلی کو خیال ہونے لگا کہ مسئلہ تعلیم کا حل یہ ہے کہ جدید اور قدیم کو ملا کر ایک معجون مرکب پیش کیا جائے۔ اس دوران میں انھیں ترکی۔ شام اور مصر کے سفر کا موقع پیش آیا۔ بظاہر تو یہ سفر وہاں کے کتب خانوں کی سیر اور الفاروق کے لئے مواد کی تلاش کی غرض سے تھا۔ لیکن اس کا ایک بڑا مقصد ان ممالک کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ تھا۔ اس میں شبلی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ شام و روم و مصر کے سارے اہم مدارس دیکھنے کے بعد دل پر جو اثر ہوا۔ اس کا بیان ان کی اپنی زبان سے سُنئے :-

اس سفر میں جس چیز کا تصوّر میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا۔ وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی ...... ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو۔ اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے لیکن قسطنطنیہ۔ شام اور مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔

دنیائے اسلام کے سب سے اہم مدرسے، جامع الازہر کی نسبت وہ لکھتے ہیں :-

مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع الازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا۔

بلادِ اسلامی کے سفر سے مولانا اس درجہ مایوس ہو کر آئے کہ قدیم تعلیم کی اصلاح کے جو منصوبے ان کے دماغ میں تھے وہ پس پشت پڑ گئے اور "مسلمانوں کی ترقی و قوت کی نسبت ان کی جو امیدیں تھیں برباد ہو گئیں" لیکن ان کی واپسی کے ایک دو سال بعد، ۱۸۹۳ء کے اخیر میں، لکھنؤ میں ندوۃ العلما کی تحریک اٹھی اور بقول سید سلیمان " اس زور سے اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی"۔ علما میں سے مولانا رشید احمد گنگوہی اس تحریک سے بالکل بے تعلق رہے اور انھوں نے شروع سے کہہ دیا کہ مجھے ندوہ کا انجام اچھا نظر نہیں آتا اور مولوی محمد علی ناظم ندوہ کو جو انھیں بلانے کے لئے گنگوہ آنے والے تھے۔ صاف لکھ دیا کہ وہ اس مقصد کے لئے آنے کی تکلیف نہ کریں لیکن بہت سے علما اور ارباب علی گڑھ[۵] نے اس کا خیر مقدم کیا۔ سرسید نواب محسن الملک اور وقار الملک نے اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا لیکن ندوہ کی صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے مولانا شبلی تھے۔ انھیں اس میں اپنی دیرینہ آرزو یعنی قدیم تعلیم کی اصلاح و تنظیم کی تکمیل ہوتی نظر آئی بلکہ آرزوؤں کا یہ متوالا، جس کی ہمت کو " شروع سے ایک نشیمن بلند کی تلاش تھی"۔ یہ خواب دیکھنے لگا کہ علما کو متحد کر کے اور ان کا " سرتاج اور شیخ الکل " بن کر وہ ہندوستانی

---

۵ ملاحظہ ہو۔ شبلی کے متعلق مولوی عبدالحلیم شرر کا مضمون

مسلمانوں کے دل ودماغ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکے گا۔

ندوہ کے آغاز نے شبلی کے مضمحل ارادوں میں پھر جان پیدا کردی وہ ابھی مذبذب تھے کہ کالج چھوڑ کر ندوہ میں شریک ہوں یا نہ کہ کالج کو دو ایک ایسے دھکے لگے جن سے ان کا فیصلہ نسبتاً آسان ہوگیا ۱۸۹۵ء میں کالج کے حساب میں شام بہاری لال خزانچی نے کوئی ایک لاکھ روپیہ غبن کر لیا۔ اس سے کالج کی مالی حالت بالکل تباہ ہوگئی جو کچھ کالج کے پاس دھن تھا وہ غبن ہو گیا اور آگے کو چندے کی راہ مسدود ہوگئی نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کی تعمیر بند ہوگئی اساتذہ کی تنخواہیں قرض ہوگئیں اور لوگوں میں یہ خیال عام ہوگیا کہ کالج کا اب باقی رہنا مشکل ہے!

علامہ شبلی اس زمانے میں کالج چھوڑنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن ابتدائی زندگی کی کشمکش اور نامساعد حالات نے انھیں بڑا محتاط بنا رکھا تھا۔ کالج سے تعلق دوامی طور پر منقطع کرنے سے پہلے وہ چاہتے تھے کہ ان کی کفالت کا کوئی انتظام ہو جائے اور وہ تجربہ کر کے یہ بھی دیکھ لیں کہ علی گڑھ سے باہر کوئی حسبِ منشا کام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اخیر ۱۸۹۶ء میں کالج سے ایک سال کی رخصت لی اور تصنیفی وظیفے کے لئے تردد شروع کیا۔ اس وقت ریاست کے مدار المہام نواب وقار الامرا تھے۔ جن کی تعریف میں مولانا ۱۸۹۵ء میں ایک زبردست قصیدہ پڑھ چکے تھے اور ان سے علی گڑھ میں ہی اچھی طرح روشناس ہو گئے تھے۔ دوسرے نواب صاحب کے ہاں مولوی سید علی بلگرامی کا، جن سے مولانا کے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ خاص رسوخ تھا۔ ان دونوں کی مدد سے سو روپے کا ماہوار وظیفہ شبلی کے نام جاری ہوا اور شرط یہ قرار پائی کہ آئندہ سے مولانا کی تمام تصنیفات سلسلۂ آصفیہ میں

شامل ہوں۔

حیدرآباد کے تصنیفی وظیفے سے مولانا کے لئے روزگار کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن اُنھوں نے تجربے کے طور پر جو رخصت لی تھی۔ اس کا نتیجہ خوشگوار نہ ہوا۔ وہ رخصت لے کر اعظم گڑھ چلے گئے لیکن یہاں ان کا دل نہ لگا اور وہ ایک سال کے بعد نومبر ۱۸۹۷ء میں کالج میں واپس آگئے۔ وہ اسی زمانے کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> باقی ترکِ تعلق، اس کی یہ کیفیت ہے کہ میں نے سال بھر کی رخصت اِسی تجربہ کے لئے لی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اعظم گڑھ سال بھر نہیں رہ سکتا۔ وہاں کوئی ایسی دلچسپی نہیں کہ سارا سال کام چل سکے۔ اس لئے کچھ یہاں (علیگڑھ) کچھ وہاں (اعظم گڑھ) کچھ ندوہ، اس طرح بسر کرنے کا ارادہ ہے۔

ایک سال کی دشت نوردی میں شبلی نے اندازہ کر لیا کہ کالج سے قطعی ترکِ تعلق ان کے لئے مفید نہیں۔ چنانچہ وہ علی گڑھ واپس آئے اور سرسید کے کاموں میں پُرانی سرگرمی سے شریک ہو گئے۔ اس وقت سرسید اور ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور دونوں کے درمیان پورا اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل تھا۔ سرسید ان دنوں ترکی اور یونان کی لڑائی اور اس کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کے شدید جذباتی تاثرات سے سخت مشوش تھے۔ انھیں یہ نظر آرہا تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی موجودہ حالت میں اس قابل تو نہیں کہ ترکی یا کسی اسلامی ملک کی کوئی عملی مدد کر سکیں لیکن اکثر انگریزوں کی ہمدردی یونان کے ساتھ تھی اس لئے انھیں ڈر تھا کہ کہیں ترکی کی جذباتی اور بے نتیجہ محبت کی خاطر ہندوستانی مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان سے وہ یک جہتی نہ اُٹھ جائے جسے اُنھوں نے بڑی مشکلات کے بعد پیدا کیا تھا اور جو ان کے خیال میں ہندوستان کے

خاص حالات کے لحاظ سے قوم کے لئے ضروری تھی چنانچہ اُنھوں نے تین چار ایسے مضامین لکھے جن میں ترکوں سے اسلامی ہندوستان کی محبت کا پورا اظہار کیا۔ مسٹر گلیڈ اسٹون اور دوسرے انگریزوں کی سخت مذمت کی لیکن یہ صاف لکھ دیا کہ ترکی سے ہندوستانی مسلمانوں کو اس لئے محبت ہے کہ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے اس لئے نہیں کہ وہ سلطان روم کو خلیفۃ المسلمین سمجھتے ہیں اور مذہبی معاملات میں اس کے احکام کے پابند ہیں۔ شبلیؔ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور ایک مدلل مضمون میں سرسید کی تائید کرتے ہوئے "تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں (مثلاً مغل بادشاہوں) نے کبھی بھی عثمانی ترکوں کی خلافت تسلیم نہیں کی۔

سرسید بھی شبلیؔ کی دلی خواہشات کی تکمیل میں ان کے ساتھ تھے۔ شبلیؔ کی یہ تجویز کہ وہ سال میں چند مہینے علی گڑھ کی ملازمت کریں اور باقی وقت ندوہ اور اعظم گڑھ میں گزاریں ایک ایسی خواہش تھی جس کی ہر تعلیمی ادارے کے منتظمین مخالفت کریں گے لیکن سرسید اس کے حق میں تھے وہ چاہتے تھے کہ شبلیؔ کے قیام سے کالج کو بھی فائدہ پہنچتا رہے اور ان کے تصنیفی کاموں میں بھی ہرج نہ ہو۔ چنانچہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ شبلیؔ سال میں چھ ماہ کالج میں قیام کریں اور چھ ماہ کی انھیں رخصت دی جائے لیکن سید محمود جن کا کالج میں بڑا عمل دخل تھا اور جن کی طبیعت اس وقت بہت بگڑ چکی تھی۔ شبلیؔ کے سخت مخالف ہوگئے۔ انھوں نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی اور شبلیؔ کے خلاف بھی بہت باتیں کہیں۔

شبلیؔ اس وقت بڑی کشمکش میں تھے۔ وہ کالج میں فقط اس شرط پر رہنے

کو آمادہ تھے کہ انھیں تصنیف و تالیف کے لئے فراغت میسر ہو اور علی گڑھ باہر رہنے کا موقع ملے۔ سرسید اس کے لئے سہولتیں پہنچانے کو تیار رہتے لیکن سید محمود، جو اس وقت جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس کے خلاف تھے۔ ابھی یہ سوال حل نہ ہوا تھا کہ قضا و قدر نے شبلی کا راستہ صاف کر دیا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے وفات پائی اور ان کی جگہ، قاعدے کی رُو سے سید محمود کالج کے سکریٹری ہو گئے۔ چنانچہ مئی ۱۸۹۸ء سے شبلی نے پہلے چھ مہینے کی رخصت لی۔ اور پھر استعفیٰ بھیج کر علی گڑھ سے علٰحدہ ہو گئے۔

علی گڑھ کالج سے شبلی کی علٰحدگی کا ذکر کرتے ہوئے، سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں ان اختلافات کو گنایا ہے جو شبلی کے "سرسید کے حلقہ سے علانیہ باہر نکلنے" کا باعث ہوئے اور اس ضمن میں، عقیدت مند شاگرد کے قلم نے عجیب بہار آفرینیاں کی ہیں۔

سرسید کی نسبت سید سلیمان نے جو کچھ بالصراحت کہا ہے یا بالایما نمایاں کیا ہے۔ اس کا نچوڑ یہ ہے:-

"سرسید...... اپنے ہم نشینوں سے اٰمنّا و صدّقنا کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔" مسلمانوں کی موجودہ تمدنی و معاشرتی بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں۔" شبلی اور سرسید کے درمیان اس لئے بگاڑ ہو گیا کہ "اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں۔ مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے۔" "عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے جس میں دونوں کو اختلاف تھا۔ سرسید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ مسلمانوں میں

بیسی تعلیم کے شیوع کو جو ان کو اُدھر سے ہٹائے۔ مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے..... ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لئے دلچسپی نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے۔"

اس کے علاوہ سید سلیمان نے شبلی اور سرسید کے سیاسی اور مذہبی اختلافات پر بھی زور دیا ہے۔ جہاں تک سیاسیات میں کسی عملی اقدام کا تعلق ہے۔ شبلی کے کارناموں کا ذکر آگے آئے گا اور مذہبی خیالات کے بارے میں مذہبی علما ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان باتوں میں شبلی اور سرسید میں کوئی حقیقی فرق تھا یا نہیں [اور دہلی و دیوبند کے علما نے اس بارے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی!] لیکن جہاں تک سرسید کے متعلق سید سلیمان کے مندرجہ بالا ارشادات ہیں۔ ان میں شاگردانہ فرطِ عقیدت نے عدل و انصاف ہی نہیں بلکہ سچائی اور صحتِ بیان کو بھی اس طرح چاروں شانے چت گرایا ہے کہ الاماں!!

مثلاً فردِ جرم کی پہلی مد کو لیجئے اور ایک مشاق انشا پرداز جس طرح واقعات اور الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اس کا ملاحظہ کیجئے۔ سید سلیمان نے اس بات کی تائید میں کہ سرسید "اپنے ہم نشینوں سے اٰمنّا و صدّقنا کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔" حالی کی حیات جاوید کا حوالہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:—

"حیاتِ جاوید اول صفحہ ۲۹۰ میں مولانا حالی نے دبے لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے۔ لکھا ہے" کہ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈیپاٹک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصلت کو چاہو۔ ان کے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو؛۔ اور چاہو۔ ان کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو۔ بہرحال

یہ خصلت ان میں ضرور تھی۔"

غالباً اس اقتباس میں سرسید کے تمام بڑے بڑے کاموں کے بجائے بُرے کاموں کا ذکر اصلاح کاتب ہے لیکن سید سلیمان نے حالی کا بیان نقل کرتے ہوئے، جس احتیاط اور انصاف سے کام لیا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ انھوں نے حالی کا پورا اندراج نقل نہیں کیا اور ایک نامکمل اقتباس دے کر سرسید کے طریق کار کی نسبت جو کچھ حالی نے بالوضاحت کہا ہے بالکل اس کے برعکس اس سے منسوب کر رہے ہیں۔ حیاتِ جاوید میں یہ اندراج اس طرح ختم ہوتا ہے:۔

گو وہ (سرسید) جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے تنگ دل نہ ہوتے تھے مگر جس اصول پر انھوں نے کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ان سے وہ ہرگز دست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے اور جس بات کو ان میں مخل سمجھتے تھے۔ اُس کو جہاں تک ان کے امکان میں تھا۔ چلنے نہیں دیتے تھے۔

سرسید ایک عملی آدمی تھے جو شخص ان اصولوں کی مخالفت کرتا۔ جن پر اُنھوں نے کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی وہ ضرور مخالفت کرتے لیکن حالی صاف کہتا ہے کہ وہ باقی، جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے!

حالی کا حوالہ نقل کرنے میں سید سلیمان نے عالمانہ احتیاط اور تقوے کا جو نمونہ پیش کیا ہے۔ اس پر تبصرہ تحصیل حاصل ہے لیکن اس بارے میں حالی کی رائے پر فیصلہ چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسرے ذریعوں سے بھی سید سلیمان کے الزام کی حقیقت پرکھی جا سکتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شبلی اور سرسید کا تسلسلِ تعلقات ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ سرسید

پنے ہم نشینوں سے آمنّا و صدقنا سُننے پر ہرگز مُصر نہ تھے۔
شبلی خود لکھتے ہیں۔ "میں سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا...... اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں" شبلی کے خطوط سرسید کے نام پڑھ لیجئے اور دیکھئے کہ سرسید اپنے کالج کے تنخواہ دار ملازموں سے کس حد تک آمنّا و صدقنا سُننے پر مُصر تھے!
شبلی قسطنطنیہ سے سرسید کو خط لکھتے ہیں لیکن اس خط میں بھی سرسید کے نظریۂ تعلیم، یعنی جدید تعلیم کی اشاعت، پر نکتہ چینی کی ہے۔

افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقۂ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا اثر تو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کی حدود جُدا رکھی گئی ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے۔ جس کا رونا ہے!

سید سلیمان اگر خطباتِ شبلی پر ہی نگہِ غائر ڈالتے۔ جسے اُنھوں نے خود مرتب کیا ہے تو وہ دیکھتے کہ اس مجموعہ میں شبلی کی جتنی تقریریں ان مسائل پر ہیں جن پر سرسید نے بھی تقریر کی۔ (یعنی پہلی اور تیسری) وہ سب کی سب سرسید کے خلاف ہیں: ایک تقریر کے تیور ملاحظہ ہوں:۔

میں سکریٹری صاحب (یعنی سرسید) کے ان الفاظ سے کہ "ہماری کانفرنس [یعنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس] بے فائدہ چیز ہے اور مفت میں ہزاروں روپے برباد کرتی ہے" ہرگز اتفاق نہیں کر سکتا بلکہ اگر سکریٹری صاحب معاف فرمائیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ رائے غلط اور بالکل غلط ہے۔

اس کا جواب سرسید نے نہایت متانت اور خندہ پیشانی سے دیا:۔

گو کہ مولانا شبلیؔ اس رائے کو غلط بتاتے ہیں مگر بلا شبہ اس قدر افسوس مجھ کو ہے کہ آج تک کسی شخص نے یہ نہیں بتایا کہ ان ہدایتوں یا رایوں پر جو ہماری مجلس تعلیمی نے قرار دیں پورا پورا عمل کیا گیا؟...... ہماری قوم کی مثال اس شخص کی ہے جو طبیب سے نسخہ لکھوائے اور دوا کا استعمال نہ کرے اور چاہے کہ صرف نسخہ ہی لکھوا لینے سے بیمار کو شفا ہو جائے۔

اب ناظرین شبلیؔ کے اپنے الفاظ سے ہی اندازہ لگا لیں کہ وہ کس حد تک سرسید کے سامنے آمنّا و صدقنا کہا کرتے تھے اور پھر یہ سوچیں کہ کیا اس اختلاف رائے کی بنا پر سرسید نے شبلیؔ کو کالج سے نکال دیا؟ یا ان کے لئے کالج میں زندگی دو بھر کر دی؟ واقعہ یہ ہے کہ سرسید کا جنازہ کالج سے پہلے نکلا اور شبلی کالج سے علٰحدہ بعد میں ہوئے!!

(یہی حال اس بیان کا ہے کہ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان' مذہب کے سوا باتں میں انگریز ہو جائیں۔ جب تک سید سلیمان یہ نہ بتائیں کہ سرسید نے کن تحریروں میں یہ تصریح کی ہے اور کن الفاظ میں'۔ اس بیان کی صحت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا لیکن ناظرین سرسید اور ان کے بیٹے سید محمود کی تصویریں ہی اُٹھا کر دیکھ لیں اور اندازہ کر لیں کہ وہ کس حد تک انگریز بن گئے تھے؟

سلیمان صاحب نے سرسید کی سوانح عمری کے سوال پر تفصیل سے لکھا ہے اور اس ضمن میں ان کے تمام اندراج کا ماحصل یہ ہے کہ سید احمد خاں اس گھٹیا قسم کا انسان تھا کہ وہ شبلیؔ کا اس لئے مخالف ہو گیا کہ شبلیؔ نے اس کی سوانح عمری لکھنے سے انکار کر دیا۔ افسوس ہے کہ سلیمان صاحب نے سرسید کو بھی اپنے اُستاد کے ظرف سے ناپا ہے اور یہ بھول گئے کہ ٹھوس اور جامد چیزوں کے لئے وہ پیمانے کام نہیں آتے جن سے سیّال چیزیں ناپی جاتی ہیں

یہ صحیح ہے کہ شبلی نے، مہدی حسن، ابوالکلام آزاد اور خود سید سلیمان سے خطوں میں سوانح عمری لکھنے کی، کہیں کنائے اشارے سے اور کہیں صاف صاف، خواہش ظاہر کی لیکن جب تک سرسید کی نسبت اس طرح کا اظہار خیال کسی قابل اعتماد ذریعے سے ہم تک نہ پہنچے۔ اس پر یقین کس طرح آسکتا ہے؟ سید سلیمان نے سرسید کی فرد جرم میں یہ اضافہ کرنے کے لئے زبانی روایات پر بھروسہ کیا ہے اور ان روایات کے لئے بھی انھوں نے شبلی کے غالی عقیدت مندوں کے حلقہ ارادت سے باہر آنے کی ضرورت نہیں سمجھی یا شاءاللہ سوانح نگار کو کیا سہولتیں میسر ہیں۔ ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ!

لیکن روایت و درایت کے اصولوں کے ماہر ہونے کی حیثیت سے سید صاحب یہ تو جانتے ہوں گے کہ اختلافی معاملات میں گھریلو روائتیں کام نہیں دیتیں۔ اس میں راست بیانی اور دروغ گوئی کا سوال نہیں۔ ذہنِ انسانی کی کمزوریوں اور مجبوریوں کا سوال ہے۔ غالباً مولوی اقبال احمد سہیل اور سلیمان یہ دعوے تو نہ کریں گے کہ شبلی کے معاملے میں وہ ایک غیر جانبدار حیثیت رکھتے ہیں لیکن جانبداری کے فقدان کے علاوہ اصل کٹھن مسئلہ یہ ہے کہ کیا راویوں کا حافظہ اس قدر درست و مستحکم اور ان کا مشاہدہ اس قدر صحیح ہے کہ پچاس ساٹھ سال کی پرانی باتوں میں ان پر اعتماد کیا جائے؟

انسانی حافظے پر اعتماد کرنے سے (جہاں جانبداری یا غیر جانبداری کا بھی کوئی سوال نہ ہو) جو غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے حیاتِ شبلی کا فاضل مصنف نا آشنا نہیں مثلاً مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ کی یاد ایام کی نسبت انھوں نے خود یہ شعر نقل کیا ہے

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں!

اسی طرح انھوں نے شبلی کے عزیز شاگرد، مولانا ضیاء الحسن علوی کا ایک طویل بیان، شبلی کے آخری ایام کی یاد میں درج کتاب کیا ہے لیکن اس میں بیانِ واقعات کی اس قدر واضح غلطیاں تھیں کہ انھیں نوٹ لکھنا پڑا۔ "مضمون نگار کو واقعہ کی صحیح تاریخ میں کچھ تشابہ ہو گیا۔"[1]

اسی طرح ۱۹۱۴ء میں ندوۃ العلما کی اسٹرائک کا مسئلہ ہے جس کا ایک سبب یہ بتایا جاتا تھا کہ کارکنانِ ندوہ کے حکم سے مفتی محمد عبداللہ ٹونکی نے شبلی کے درسِ بخاری کی ممانعت کر دی۔ شبلی کہتے تھے کہ مفتی عبداللہ صاحب نے اس حکم کا ذکر خود ان سے کیا لیکن مفتی صاحب شبلی کی اس روایت کو غلط بتاتے تھے۔ اس پر شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں، متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبق رد کئے پر اپنی مجبوری ظاہر کی اور کہا کہ میں کیا کروں ......
>
> اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہیں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

جب دو مقدس ہستیاں، ایک ہی واقعہ کے بیان میں اس قدر مختلف الرائے ہو سکتی ہیں تو ان کے شاگردوں اور عام دنیاداروں کی کیا کیفیت ہو گی؟ لیکن زبانی روایات پر بھروسہ کرنے کی اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز مثال، مکاتیبِ مہدی میں ملتی ہے۔ مہدی حسن صاحب نے ایک مضمون

---

[1] حیاتِ شبلی ص ۶۶۴ - ۶۶۵

میں آزاد اور مولانا نذیر احمد کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا۔ جسے انھوں نے مولانا شبلی کی زبان سے سنا تھا لیکن مولانا عبدالماجد دریا آبادی جو اس واقعہ کے قائل نہ تھے۔ اس کی تردید چھاپنا چاہتے تھے۔ (اور وہ بھی مولانا شبلی کی زبانی!!) مہدی حسن، ماجد صاحب کو لکھتے ہیں:۔

آزاد اور نذیر احمد کا واقعہ ایک غیر ضعیف راوی یعنی خود شبلی کا بیان کردہ ہے۔ آزاد کے استادانہ ٹھاٹھ کے سلسلہ میں مولانا نے یہ تذکرہ فرمایا تھا۔

کہیں آپ کو سہو تو نہیں ہوتا۔ تردید کیسی؟ اور وہ بھی شبلی کی زبانی!!

انسانی حافظے کی یہی بوالعجبیاں ہیں۔ جن کی بنا پر کوئی محتاط مورخ یا تذکرہ نگار، اختلافی مسائل میں زبانی روایات پر اعتماد نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ انھیں تائید یا تائیدِ مزید کے لئے لاتا ہے لیکن سید سلیمان ان ہی روایات کی بنا پر عجیب و غریب نظریوں کی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جب وہ ان گھریلو روایات کی تائید کے لئے کوئی تحریری حوالہ دیتے ہیں تو جس بے تکلفی سے وہ اسے نقل کرتے ہیں یا اس کا خلاصہ دیتے ہیں۔ اس سے صاف نظر آجاتا ہے کہ شبلی کے معاملے میں ان کی لاپرواہی بڑی خطرناک ہے!

مثلاً وہ یہ لکھ کر کہ "اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے"۔ اس پر ایک فٹ نوٹ بڑھاتے ہیں "حیات جاوید میں مولانا حالی نے بھی ان کی اخیر عمر کی اس خواہش کا ذکر کیا ہے"۔ لیکن اگر آپ حیاتِ جاوید اٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ حالی کہیں یہ نہیں کہتا کہ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری "لکھی جائے"۔ بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ سرسید شروع میں اپنی سوانح عمری

لکھے جانے کے خیال کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ لیکن جب سوانح عمری لکھی جانی شروع ہوگئی بلکہ بہت حد تک لکھی جا چکی تو وہ ایک خاص وجہ سے (جس کی حالی وضاحت کر دیتا ہے)۔ یہ جاننے کے مشتاق تھے کہ اس میں (یا کم از کم اس کے ایک خاص حصے میں) کیا لکھا جا رہا ہے۔

حیاتِ جاوید کا متعلقہ اندراج حسبِ ذیل ہے:۔

اوّل اوّل تو جب کبھی سرسید کے سامنے ان کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں، سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں۔ کنکوے اڑائے۔ کبوتر پالے۔ ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے مگر آخر میں جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے۔ ان کو اس بات کے دریافت کرنے کا زیادہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ ان کی اخیر بائیوگرافی میں کیا لکھا جا رہا ہے اور اسی لئے وہ اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے چالیس برس مذہب کی حمایت میں بسر کئے ہوں اور سوائے تکفیر و تذلیل کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو ... اس سے زیادہ کون شخص اس بات کے دیکھنے کا خواہشمند ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اس کی مذہبی تصنیفات سے نظر انصاف سے بحث کرے۔ پس اگر ہم یہ جانتے کہ سرسید کا ناگزیر وقت قریب آپہنچا ہے تو کم سے کم جو کچھ ہم نے سرسید کی مذہبی خدمات کی نسبت لکھا تھا وہ ضرور ان کی نظر سے گزران دیتے

حالی بطور ایک سوانح نگار کے شبلی سے کم پایہ کا نہیں۔ اگر ایک کی الفاروق اردو ادب کا زیور ہے تو دوسرے کی یادگارِ غالب ہمارے ادب کا شاہکار

خزانہ ہے لیکن سرسید نے حالی کے لائف لکھنے پر جن خیالات کا اظہار کیا۔
ان ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی سوانح عمری لکھوانے کے لئے کس
طرح بیتاب تھے!!

مندرجہ بالا اقتباس میں حالی نے صاف بتا دیا ہے کہ جب اُنھوں نے
سرسید کی لائف لکھنے کا خیال ظاہر کیا تو سرسید اس خیال کا مذاق اڑاتے
رہے اس کے علاوہ حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں حالی یہ بھی بتا دیتے ہیں
کہ شروع میں جب اُنھوں نے سرسید کی سوانح عمری لکھنی چاہی تو
سرسید نے کِس حد تک ان کی مدد کی!

حالی یہ لکھ کر، کہ انھوں نے سرسید کی زندگی کے واقعات قلمبند کرنے
شروع کر دئے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

میں نے ..... کم و بیش سو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسید کے پاس بمقام
علی گڑھ اس غرض سے بھیجے کہ ان کے جواب مختصر طور پر لکھ دیں۔ مگر وہ کاپی
ان کے پاس یوں ہی پڑی رہی۔ کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا۔

حیاتِ جاوید کے دیباچہ سے ہم نے جو طویل اقتباسات دئے ہیں
ان سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حالی نے کیا کہا اور سید سلیمان
اس سے کیا منسوب کر رہے ہیں لیکن بیانِ واقعات میں سید صاحب نے
جو بے تکلفی برتی ہے۔ اس کے نمونے حیاتِ شبلی کے ہر صفحے پر بکھرے
پڑے ہیں اور سرسید اور حالی کے بیانات خاص طور پر اس کے تختۂ مشق
بنے ہیں۔ مثلاً حیاتِ جاوید کے متعلق شبلی کے جلے کٹے فقروں کا ذکر کر کے
سید سلیمان لکھتے ہیں:۔

"وہ لکھی جو مولانا (شبلی) نے اس کتاب کو مدلل مداحی یا کتاب المناقب کہا جس سے مولانا

حالی کی تنقیص مقصود نہ تھی بلکہ یہ مقصود تھا کہ اس کتاب میں صاحبِ سوانح کی زندگی کے دونوں رُخ نہیں۔ مولانا حالی کو اس کمی کا احساس خود بھی تھا چنانچہ اُنھوں نے دیباچہ میں خود اپنے اس احساس کی تشریح اور اپنے طرزِ عمل کی توجیہ کی ہے۔

پتہ نہیں سید سلیمان دوسروں سے بیانات منسوب کرتے وقت فقط اپنی یاد پر بھروسہ کرکے انھیں دیکھتے نہیں یا انہیں خیال ہے کہ کوئی دوسرا انھیں کھول کر نہیں دیکھے گا۔ انھوں نے آخری دو فقروں میں جو کچھ حالی سے منسوب کیا ہے۔ وہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ حالی کو حیاتِ جاوید کی نسبت ہرگز یہ احساس نہ تھا کہ اس میں سرسید کی زندگی کے فقط ایک (خوشنما) رُخ کی تصویر ہے اور انھوں نے اس احساس کی کوئی توجیہ نہیں کی بلکہ وہ تو حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے سعدی اور غالب کی سوانح یوں میں اصحابِ تذکرہ کے "پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی"۔ لیکن حیاتِ جاوید کی نسبت وہ بالتصریح بتاتے ہیں کہ اس میں انھوں نے سرسید کی زندگی کے دونوں رُخ دکھائے ہیں اور اس پر نکتہ چینی کا پورا قصد کیا ہے۔ وہ اس کتاب کے متعلق دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے . . . . . بس ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

حیاتِ جاوید کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے دیباچہ میں حالی نے نکتہ چینی کا جو ادعا کیا تھا۔ اس میں وہ پورے نہیں اُترے [اگرچہ حالی نے ملائم اور متین طریقے سے جا بجا سرسید کی بعض چیزوں پر چشم نمائی کی ہے اور حیاتِ شبلی میں سرسید پر جتنے جائز اعتراضات ہیں۔ ان سب کے ساتھ حیاتِ جاوید کا حوالہ موجود ہے] ۔ لیکن کم از کم سید سلیمان کا یہ فرمانا کہ حالی کو اس امر کا احساس تھا کہ حیاتِ جاوید میں سرسید کی زندگی کا فقط ایک رُخ ہے اور انھوں نے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے صریح غلط بیانی ہے۔

تعجب ہے کہ تحریری حوالوں کے اندراج اور تلخیص میں تو حضرات ندوہ اس شدید احتیاط اور درست بیانی کا ثبوت دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے حافظے پر ایمان لاکر، ان کی زبانی روایات کو صحیح مان لیا جائے۔ خواہ تمام قرائن اور واقعاتِ معلومہ ان کے برخلاف کیوں نہ ہوں!

بظاہر اس خواہش کی تعمیل روایت و درایت کے تمام اصولوں کے خلاف ہے لیکن ہم ناظرین سے کہیں گے کہ وہ سرسید کی سوانح عمری و الاقصہ صحیح مان لیں۔ بات تو عجیب ہے اور سرسید کی شخصیت کا جو نقشہ دوست دشمن نے کھینچا ہے اس پر کسی طرح نہیں پھبتی لیکن مولوی اقبال احمد سہیل اس قصہ کے راوی ہیں اور مولانا سلیمان ندوی، اس کے ناقل۔ ان پر کیوں نہ اعتماد کیا جائے ع

حدیث اگرچہ غریب است راویان ثقہ اند

لیکن عربی کی تعلیم سے سرسید کی جس مخالفت کا سید سلیمان نے ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق ہم حیران ہیں کہ ان کے بیان کو صحیح تسلیم کریں۔ یا ان کے اُستاد کے ارشاد کو جو مولوی بشیر الدین کا ایک فقرہ نقل کر کے لکھتے ہیں :۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ صرف انگریزی علوم و فنون میں کمال حاصل کرنا اور عربی زبان اور مذہبی علوم سے بے بہرہ ہونا تمام دینی و دنیوی ترقی کا وسیلہ ہے؟ اگر یہ مطلب ہے تو محض تہمت ہے کہ سر سید مرحوم کا یہ خیال اور یہ رائے تھی۔

اس مجلس مقدس میں بیچارے سر سید کو کہاں بار مل سکتی ہے۔ لیکن اگر سید سلیمان کے ایوانِ عدالت میں ملزم کو بھی کچھ بولنے کا حق حاصل ہے تو سر سید کا اپنا بیان بھی موجود ہے۔ وہ نواب عماد الملک کو مسلمانوں کی عام تعلیم کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:-

اسی کے ساتھ یہ تدبیر چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درسِ کتب مذہبی جو معدوم ہوجاتا ہے کسی طرح قائم رہے۔ اگر عربی اور فارسی ہم میں سے معدوم ہوجائے گی تو اس کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہوجائے گی۔

شبلی کی زندگی میں ایک مرتبہ سید سلیمان نے اپنے اُستاد کی حمایت میں قلم اُٹھایا تھا اور ان کے مخالف مولوی خلیل الرحمٰن سہارنپوری سے ایک اخبار میں بعض ایسے سوالات کئے تھے۔ جن کی تہ میں الزام اور اعتراض تھے لیکن یہ الزامات بے بنیاد تھے۔ اس پر ان کے کامل الفن اُستاد نے انھیں ٹوکا اور ایک خط میں انھیں لکھا:-

تم نے وکیل میں جو سوالات ناظم سے کئے ہیں۔ اُس کے اکثر تیر ہوائی ہیں

سر سید کے خلاف بھی سید سلیمان نے بہت سے "ہوائی تیر" چلائے ہیں اور وہ بھول گئے کہ ان ہوائی تیروں سے سر سید کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے۔ اُستاد کی محبت سے سرشار ہوکر کیا ہے۔ لیکن شبلی کے متعلق ان کی فرطِ عقیدت کا یہ پہلو ایسا ہے کہ اگر شبلی اس پر (مولوی خلیل الرحمٰن پر کئے ہوئے اعتراضوں کی طرح) "مجھے میرے دوستوں سے

بچاؤ" کہیں نو بجا ہے۔ سید سلیمان نے شبلی کے خطوط، مضامین، اشعار مرتب کیے ہیں۔ ان چیزوں کو مرتب کرتے وقت، انھوں نے بہت سی قابلِ اعتراض باتوں پر سیاہی پھیر دی ہے لیکن عقیدت مند آنکھوں کو قابلِ اعتراض باتیں مشکل سے ہی نظر آتی ہیں اور سید سلیمان کی احتسابی کارفرمائی کے بعد، اب بھی ان چیزوں کا یہ عالم ہے کہ آپ شبلی کی شخصیت کے خلاف کوئی فردِ جرم مرتب کرنا چاہیں تو آپ کو شبلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخی یا دستاویزات مل جائیں گی۔ اپنے استاد پر یہ احسان کرکے اور حیاتِ شبلی میں بھی بعض ایسے رخنے چھوڑ کر، جن سے شبلی کی اصل شخصیت پر تھوڑی بہت نئی روشنی پڑ جاتی ہے۔ سید سلیمان اب اسے، اپنے اُستاد کی خیر خواہی سمجھتے ہیں کہ ہر اُس شخص کا منہ چڑھائیں جس کا قد و قامت شبلی سے بلند ہے!

ہم سید سلیمان سے، ان کے ایک دوست کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ "شیش محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر پھینکنا خوش ادائی سہی لیکن کیا یہ فعل دانائی بھی ہے؟"

اُنھوں نے فارسی کا وہ پرانا شعر تو سُنا ہوگا ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ نیکاں دہد!

سید سلیمان کی اس روش کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ (اور ہم نے سُنا ہے کہ ان کی کتاب کے جواب میں شبلی کے قدیمی دوست اور محسن، مولوی محمد امین زبیری ایک تفصیلی کتاب لکھ رہے ہیں) لیکن سید صاحب کی اس "نادان دوستی" کا ہمیں اس لیے بھی افسوس ہے کہ اُنھوں نے سرسید کی جو بھونڈی اور خلافِ واقعہ تصویر کھینچ کر بیچارے شبلی کی مخالفت کا سامان کیا ہے۔ وہ شبلی کے دل و دماغ کی نہیں۔ شبلی کو سرسید سے لاکھ اختلاف سہی لیکن سرسید کی نسبت

ان کی وہ گری ہوئی رائے ہرگز نہ تھی جو سید سلیمان کی ہے جنھیں سرسید کو قریب سے دیکھنے کا کوئی موقع نہیں ملا یا ان لوگوں کی ہے جو حقیقی واقعات سے بے خبر ہیں اور سرسید کو فقط مولوی طفیل احمد منگلوری کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ آپ سرسید کے اس کارٹون کو دیکھیے' جو سید سلیمان نے حیات شبلی میں پیش کیا ہے اور اس کا شبلی کی اس تصویر سے مقابلہ کیجیے' جو شبلی نے اس وقت کھینچی۔ جب وہ علانیہ سرسید کے خلاف صف آرا تھے شبلی مسلم گزٹ کے مشہور سلسلۂ مضامین میں سرسید کی نسبت لکھتے ہیں:۔

وہ پُرزور دست و قلم، جس نے اسباب بغاوتِ ہند لکھا تھا اور اُس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا۔ کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پُرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا وہ جاں باز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔ وہ انصاف پرست.....

سید سلیمان نے اس بات پر ... زور دیا ہے کہ سرسید کی وفات پر شبلی نے کوئی مرثیہ نہیں لکھا۔ مرثیہ نہ لکھنے کے بیسیوں وقتی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن سرسید کی وفات پر شبلی نے ....

.... جو نہایت مختصر سا خط ایک دوست کو لکھا۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شبلی کس حد تک سرسید کی عظمت اور قومی اہمیت کے معترف تھے۔ یہ خط' سوائے ایک شعر کے تمام تر عربی میں لکھا گیا اور ہم سید سلیمان کی کتاب سے ہی اس کا ترجمہ

پیش کرتے ہیں :-

نے دانم حدیث نامہ چوں است
ہمیں دانم کہ عنوانش بخوں است

قومی عمارت کے ستون ہل گئے۔
یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں گئے۔
یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔
میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔

شبلی کی علی گڑھ کالج سے علٰحدگی کا ذکر کرتے ہوئے، سید سلیمان سے شبلی اور سرسید کے اختلافات کی جو بحث چھیڑ دی ہے اور جس انداز سے اس بحث کو نبایا ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف شبلی کے حق میں نیک نہ ہوگا بلکہ ہمارے خیال میں سرے سے یہ بحث غیر ضروری ہے۔ کالج سے شبلی کی علحدگی کے لئے شبلی اور سرسید کے اختلافات گنانے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس کی وجہ، نہایت وضاحت سے حضور نظام کے اس فرمان میں بتی جس میں شبلی کے نام تصنیفی وظیفے کا اعلان ہے اور جس کے بعد شبلی نے کالج میں مستقل قیام کا خیال ترک کر دیا۔ اس فرمان کے الفاظ ہیں :-

مولوی شبلی صاحب، جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں۔ چار ہفتہ سے بلدہ میں مقیم ہیں۔ مولوی صاحب ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں....

اب ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں

کالج سے شبلی کی علحدگی کا باعث سرسید سے اختلافات نہ تھے کیونکہ اگر شبلی کے لئے سرسید کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہوتا تو وہ سرسید کی زندگی میں ہی کالج سے علحدہ ہو جاتے بلکہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ کالج کی معمولی درس و تدریس' سے ان کے تصنیفی کاموں میں ہرج ہوتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اپنے اصل کام' یعنی تصنیف و تالیف کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکالیں!

شبلی کے بہت سے مخلص دوست' ان کے علی گڑھ چھوڑنے کے خلاف تھے۔ مہدی حسن انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہ میرے دل کا چور ہے۔ جسے آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ میں آپ کو کالج میں دیکھنا چاہتا تھا" لیکن ہمارے خیال میں شبلی کا فیصلہ صحیح' اور ٹھوس وجوہ پر مبنی تھا۔ شبلی نے عمر کے آخری دو تین سال میں علی گڑھ کی جس طرح مخالفت کی وہ ضرور افسوسناک ہے۔ اس سے نہ صرف شبلی یا ندوۃ العلما کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ جیسا کہ شبلی نے بالآخر محسوس کیا۔ قوم کو نقصان پہنچا اور قومی شیرازہ بکھر گیا۔ لیکن جہاں تک علی گڑھ چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہونے یا ندوہ کی خدمت کرنے کا خیال تھا۔ یہ فیصلہ دانشمندانہ تھا۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں' جب تک کسی جوہر قابل کے لئے خاص سہولتیں نہ بہم پہنچائی جائیں' معمولی درس و تدریس' میں قابل اساتذہ کے وقت کا جس طرح خون ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ شبلی کو نظر آتا تھا کہ یہ کام تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ وہ کیوں نہ اپنے تئیں اس چیز کے لئے وقف کریں جس کے لئے وہ خاص طور پر موزوں ہیں اور اگر ہم ان علمی' ادبی اور قومی کارناموں کا

موازنہ، جو شبلی کے آخری سولہ سالوں میں عمل میں آئے۔ ان کاموں سے کریں جو شبلی نے علی گڑھ کے سولہ سالہ قیام میں کئے تو صاف نظر آتا ہے کہ شبلی کا فیصلہ نہ صرف ان کی ذات کے لئے، بلکہ قومی نقطۂ نظر سے بھی صحیح تھا۔

شبلی کی زندگی میں غور و تفکر اور عبرت آموزی کا بڑا اسامان ہے وہ ایک کامیاب اولوالعزم باپ کے بیٹے تھے۔ خود بھی شروع سے بلند حوصلہ اور عالی ہمت تھے۔ علی گڑھ آنے سے پہلے ان کے ارادوں کی راہ ابھی معین نہ ہوئی تھی بلکہ جس طرف ان کا جوشِ طبیعت انھیں لے جارہا تھا۔ ادھر کی راہ نوردی خداداد خوبیوں کا اتلاف بیجا تھا۔ علی گڑھ پہنچ کر ان کی منزل مقصود طے ہوگئی اور ان کی زندگی کی "اسکیم" (جسے بنانے اور پیش نظر رکھنے کی، یہ مردِ باتدبیر اپنے سب لائق تلامذہ کو ہدایت کیا کرتا تھا) تیار ہوگئی۔ اب ان کی کشتی موجوں کے رحم پر نہ تھی بلکہ ان کی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ اس کی راہنمائی کرتا۔

شبلی کی منزلِ مقصود تو معین ہوگئی۔ لیکن کامیابی کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے اُنھوں نے فوراً سر توڑ دوڑ نہیں شروع کر دی جس سے بالعموم پُرجوش نوجوان اپنی مہم کا آغاز کرتے ہیں اور جلد ہی تھک کر یا راہ کی صعوبتوں سے گھبرا کر ہمت ہار دیتے ہیں۔ شبلی نے برسوں منزل اور جادۂ منزل کا مطالعہ کیا۔ دائیں بائیں سے چل پھر کر اس راہ کو قریب سے دیکھا۔ راہ کی مشکلات سے واقفیت حاصل کی اور جب تک ان کے پاس معقول زادِ راہ فراہم نہ ہوگیا۔ انھوں نے آگے قدم نہ بڑھایا۔ آزادانہ قومی خدمت کرنے کے ارادے ان کے ایک مدت سے تھے لیکن علی گڑھ میں انھوں نے اپنے

آپ کو اس کے لئے تیار کیا۔ اعلیٰ پیمانے پر کام کرنے کے جو وہاں نمونے تھے انھیں غور سے مطالعہ کیا۔ اپنے وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی مسلمان کو برسوں قریب سے دیکھا جس طرح اس نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد دوبارہ شادی نہ کی تھی۔ اسی طرح خود بھی ۱۸۹۵ء میں پہلی بیوی کی وفات پر دوبارہ تاہل نہ کرنے کا عہد کیا۔ کتابیں اور نظمیں لکھ اور چھپوا کر اپنی استعداد اور عوام کی گرویدگی کا اندازہ لگایا۔ اس کے باوجود وہ علی گڑھ سے اس وقت تک علٰحدہ نہ ہوئے جب تک انھوں نے حیدرآباد کے وظیفہ سے "زادِ راہ" کا پورا سامان نہ کرلیا اور قطعی علٰحدگی اس وقت اختیار کی۔ جب حالات نے بالکل مجبور کر دیا ؎

چاک کر مت جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے!

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ادبی شاہکار تذکرہ میں شبلی کی غیر معمولی احتیاط پر چشم نمائی کی ہے۔ بلاشبہ جن مساعد حالات سے شبلی کو سابقہ پڑا ان کی وجہ سے یہ سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈر جاتا تھا لیکن یہ فیصلہ تو اب مستقبل کا مورخ ہی کرے گا کہ شبلی اور ان کی قوم کے لئے شبلی کا تردد و تامل زیادہ مضر ثابت ہوا ہے یا مولانا ابوالکلام آزاد کی خوش اعتمادی تیقنِ مطلق اور انانیت! ؛

———— ٠.٠ ————

کشمکش

علی گڑھ چھوڑنے کے بعد شبلی کو دو تین سال سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی صحت ان دنوں خراب رہنی شروع ہو گئی تھی اور وہ قیام کالج کے دوران میں ہی سیر و سیاحت کے لئے کشمیر جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ کالج سے فراغت ملی تو دیرینہ ارادے کو پورا کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور کالج سے رخصت ہوتے ہی جون ۱۸۹۸ء میں انھوں نے کشمیر کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر وہ سخت بیمار ہو گئے اور جب تک یہاں رہے۔ بیمار ہی رہے وہ سفر میں تنہا گئے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی ملازم بھی ساتھ نہ تھا۔ کشمیر کے احباب نے بڑی خدمت کی لیکن شبلی نے یہاں بہت صعوبتیں اٹھائیں اور جب طبیعت ذرا سنبھلی تو جولائی کے اخیر میں وطن کا رخ کیا۔

یہاں پہنچکر انھوں نے الفاروق کو جسے انھوں نے علی گڑھ چھوڑنے سے چار پانچ سال پہلے شروع کیا تھا۔ اختتام پر پہنچایا۔ لیکن صحت کا اب بھی یہ حال تھا کہ آج اچھی ہے تو کل خراب۔ بلکہ گھنٹے گھنٹے کے بعد حالت بدلتی تھی۔ اس دوران میں وہ لکھنؤ گئے۔ ندوہ کے دفتر میں قیام کر کے لکھنؤ کے اطبا کا علاج کیا لیکن طبیعت پھر بھی راہ پر نہ آئی اور وہ اعظم گڑھ واپس آ گئے۔ نواب محسن الملک کو ان کی علالت کا پتہ چلا تو عیادت کیلئے

اعظم گڑھ آئے۔ تین دن تک مولانا کے مکان پر مقیم رہے اور انھیں دیکھ کر علی گڑھ واپس گئے۔

اس دوران میں مولانا کی حالت سنبھل گئی تھی لیکن اگلے سال ہی پھر مرض کا سخت دورہ پڑا اور مولانا نے دہلی جاکر حکیم عبدالمجید خاں سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ نواب محسن الملک بھی ان کے ساتھ جانے والے تھے اور مولانا نے نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو بھی لکھا کہ وہ حق دوستی ادا کریں اور ساتھ جائیں۔ مولانا کی بیماری کا یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ اُنھوں نے عالم مایوسی میں اپنی وصیت بھی لکھ لی۔ لیکن خدا کی شان ہے۔ انتہائی تاریکی کے بعد ہی صبحِ اُمید نمودار ہوتی ہے۔ وہ اس حالت میں تھے کہ اعظم گڑھ میں ایک مسلمان اسسٹنٹ سرجن (ڈاکٹر مصطفٰی خاں) مقرر ہوئے۔ وہ مولانا کے بھائی مولوی محمد اسحاق کے دوست تھے۔ اُنھوں نے یہ تشخیص کی کہ مولانا کا دل غایت ضعف سے اپنا کام ٹھیک طرح نہیں کر رہا ہے اور بڑی مستعدی سے اس ضعف کا علاج شروع کیا۔ ایک طویل سلسلۂ علاج کے بعد جس میں مولانا کو ڈاکٹر مصطفٰی خاں کی تبدیلی کے بعد گونڈہ بھی جانا پڑا اور ایک ہزار سے زائد خرچ اُٹھا مولانا کو صحت ہوئی اور وہ پھر سے قومی کاموں میں ہاتھ لگانے کے قابل ہوئے۔ حالی نے قطعۂ تہنیت لکھا۔

اللہ الحمد پس از نا خوشی و رنجِ دراز ۔۔۔ شبلی ما به مراد از سرِ بالیں برخاست

بود در علتِ او علتِ قومی مضمر ۔۔۔ لاجرم صحت او بهرِ همه قوم شفاست

بسکه او روحِ دمیده است به تاریخِ سلف ۔۔۔ هر قدر فخر به ذاتش بکند قوم رواست

زندہ تا دیر بمانا د کہ بر قدِ کسے   بعد از و خلعتِ تحقیق نمی آید راست!

مولانا کی بیماری پتہ نہیں کس قسم کی تھی کہ ان کے معالج' ڈاکٹر مصطفےٰ خاں نے انھیں دوبارہ شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ مولانا کی پہلی بیوی' اس سے پانچ سال پہلے وفات پا چکی تھی اور مولانا کا دوبارہ تاہل کا ارادہ نہ تھا لیکن اب طبّی احکام کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ اتفاق سے جو لڑکی مولانا کو پسند آئی وہ بہت ہی کمسن تھی۔ مولانا کے کئی اعزّہ اس رشتے کے خلاف تھے۔ مولانا نے وعدہ کیا کہ وہ شادی کے بعد کچھ وقت حالتِ مجرّدی میں گزاریں گے اور یہ بھی گوارہ کرنے کو تیار تھے کہ عقد کے بعد دو سال تک لڑکی کا "کسی قسم کا آنا جانا کچھ نہ ہو" لیکن ان کے صاحبزادے حامد شبلی کو یہ رشتہ سخت ناگوار گزرا۔

ہم مولانا شبلی کے اس غم و غصہ کا ذکر کر چکے ہیں جو اُنھوں نے اپنے والد شیخ حبیب اللہ کی دوسری شادی پر محسوس کیا تھا۔ سوتیلی ماں کی آمد کے خیال سے ان کے بڑے بیٹے کی بھی وہی حالت ہو گئی جو ان کی اپنی ہوئی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ حامد شبلی تو باپ کا گھر ہی چھوڑ کر چلے گئے اور دربھنگہ سے باپ کو خط لکھا کہ "اب آپ مجھ سے مایوس ہو جائے"۔ باپ کو بیٹے کی اس حرکت کا بڑا رنج ہوا۔ چار وقت تک شبلی نے کھانا نہیں کھایا اور ہر وقت رویا کیے۔

دربھنگہ سے حامد شبلی بہار تشریف لے گئے۔ جہاں مشہور اہلِ قلم' صوفی بزرگ' شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا مزار ہے۔ وہاں وہ سجادہ نشین صاحب کے مرید ہوئے۔ گیروا کپڑے پہن کر ترکِ دنیا کیا اور ایک آدھ مہینہ بالکل جوگیوں کی طرح بسر کیا۔ اس دوران میں کسی وقت اُنھوں نے اپنے والد کا نام نہ لیا

سجادہ نشین صاحب جو فارسی کے شاعر بھی تھے۔ مولانا کو خوب جانتے تھے۔ اُنھوں نے خط لکھ کر مولانا کو حامد کی آمد کے متعلق مطلع کیا اور اپنی بعض فارسی مثنویاں بھی ارسال کیں۔ مولانا کو بیٹے کا پتہ ٹھکانہ معلوم ہوا تو انھوں نے ایک دو معتبر آدمی بھیج کر اسے بُلایا۔ حامد صاحب اب بھی آنے پر آمادہ نہ تھے لیکن مرشد نے مجبور کیا کہ اطاعت والدین ہر طرح فرض ہے اور انھیں حکم مرشد کی تعمیل میں والد کے پاس واپس جانا پڑا۔ مولانا شبلیؒ ۵ رمئی سنہ ۱۹۰۶ء کو ایک خط میں اپنے بھائی مولوی محمد اسحٰق کو حامد کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"حامد کی نسبت تمام دنیا کے برخلاف میرا ہی خیال صحیح تھا۔ اس کے مفصل حالات عندالملاقات۔

شفیع ماسٹر اس کو جا کر لے آئے لیکن جس لباس میں اس کو دیکھا۔ وہ گیروا کرتہ اور گیروا تہمد تھا۔ اس نے فقر اختیار کیا اور وہ صرف اس وجہ سے یہاں آنے پر راضی ہوا کہ اس کے پیر نے اس کو اطاعتِ والدین پر مجبور کیا وہ پھر جانے پر مصر ہے اور کسی طرح نہیں ٹھہرتا۔

فقر اچھی چیز ہے لیکن وہ جوگیانہ قالب میں ڈھلنا چاہتا ہے اور اس میں کوئی ریاکاری نہیں۔ فقط دماغ کی خرابی کا قصور ہے اور اصل چیز میری قسمت۔"

شبلیؔ کی بعض تحریریں اور ان کے حالاتِ زندگی بہ نگہِ غائر دیکھیں۔ تو خیال آتا ہے کہ ان کے والد کی دوسری شادی کے بعد ان کے آبائی گھر سے وہ فضا مفقود ہوگئی تھی جس میں والدین کو اولاد سے شفقت و محبت .... اور اولاد کو والدین سے ارادت اور اطاعت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ شبلیؔ کے مکتوبات شائع کرتے وقت ایک دو جگہ

ایسے مقامات پر سیاہی پھیر دی گئی ہے۔ جن میں شاید ان کے والد کی طرف زیادہ شکایت آمیز اشارہ ہے (مثلاً مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۴۴ میں) لیکن جو چیزیں باقی ہیں۔ ان سے بھی بیٹے کی شکر رنجی اور اختلاف کے اثرات صاف جھلکتے ہیں۔ اپنے والد کی زندگی میں شبلی نے اپنی سوتیلی ماں سے جو سلوک روا رکھا۔ ظاہر ہے۔ وہ ان کے والد کو سخت ناگوار ہوگا۔ اور تقسیم جائداد کے معاملے میں تو بڑے بیٹے کو باپ سے علانیہ اختلاف تھا۔ (اگرچہ شبلی کی سعادت مندی کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے یہ اختلاف ادب کی حد سے باہر نہیں ہونے دیا۔) اپنے سگے بھائی مہدی حسن سے جو بڑے بھائی کے مقابلے میں والد کے ہمخیال تھے۔ شبلی کو ان کے ولائت جانے کے بعد سے سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ تقسیم جائداد والے خطوں میں "میاں مہدی" کا صاف شکایت آمیز ذکر ہے۔ ایک اور خط میں کہتے ہیں۔ "مہدی کے جب ایسے خط آیا کریں تو اس سے مجھ کو مشرف نہ کیا کرو۔" مہدی کی وفات پر شبلی نے جو خط لکھا۔ اس سے بھی دو بھائیوں کی ناراضی کا پتہ چلتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے جائے گا ورنہ مجھ پر لعنت اگر اس سے ناراض رہتا۔

ہائے سب برائیوں پر بھی وہ سب سے اچھا تھا

شبلی کو اپنے آبائی گھر میں پدرانہ شفقت اور برادرانہ محبت کا جب اس قدر تھوڑا حصہ ملا ہو تو پھر اس پر جائے حیرت نہیں کہ ان کی اپنی اولاد بھی اس معاملے میں بڑی خوش قسمت نہ تھی۔ شبلی کے کئی خطوں میں ان کے بیٹے حامد کا ذکر ہے لیکن زیادہ تر شکایت سے لبریز ہے۔

بلکہ بعض جگہ تو سخت بیزاری کا اظہار ہے۔ ۱۸۹۸ء کے ایک فارسی خط میں مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں (ترجمہ)

حامد نے اپنی سادگیوں سے جو راست نما دروغ کی طرح تھیں۔ مجھ کو اس طرح فریفتہ کیا کہ میں نے کبھی اس کی طبیعت و عادات کو غور سے نہ دیکھا لیکن اس دوران میں حالات سے یک بیک پردہ اُٹھ گیا اور پتہ چلا کہ اس "تیرہ بخت، بدترین نوجوانان" نے بات کو حد سے گزار دیا تھا۔ پھر بھی میں نے کچھ نہ کہا اور اپنے دل کو دانتوں سے چبا کر رہ گیا

آگے چل کر اسی خط میں فرماتے ہیں (ترجمہ)

اگرچہ حامد سے میرا محبت کا تعلق یکبارہ ٹوٹ گیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے پھر اپنے پاس بلاؤں لیکن چونکہ دونوں گھروں کا یہی ایک چراغ ہے اس لئے علاج معالجہ ترک نہیں کیا جا سکتا۔ پتہ لگانا چاہئے کہ وہ تیرہ باطن اپنے کئے پر پشیمان ہے یا پہلے سے بھی زیادہ شوخ اور بے حیا ہو گیا ہے

حامد شبلی کی نسبت تو شاید کہا جائے کہ انھوں نے جو حرکتیں مختلف موقعوں پر کیں اُن سے پدری مہرو محبت کا سرچشمہ خشک ہو گیا لیکن شبلی کی دوسری اولاد فاطمہ سے جن کی نسبت سید سلیمان کہتے ہیں۔ "مولانا ان کو بہت چاہتے تھے" اور جنہیں خود شبلی لکھتے ہیں۔ (اور کس قدر عبرتناک اعتراف ہے!) کہ "میری اولاد میں جس کو مجھ کو پدری محبت ہے صرف تمہیں ہو۔ اس کے نام بھی شبلی کے خطوط پڑھیں تو کسی خاص شفقت کا اظہار نہیں ملتا۔ فاطمہ خانم کے نام شبلی کے تین خط چھپے ہیں۔ پہلے دو خط تو وہ رقعے ہیں جو انھوں نے ندوۃ العلما میں اپنے دفتر سے مکان پر بھیجے۔ ان دنوں فاطمہ خانم "سخت بیمار"

اور لکھنؤ بہ غرضِ علاج آئی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے پتہ نہیں کس بات سے متاثر ہو کر باپ سے یہ خیال ظاہر کیا کہ مجھے دو چار دن میں واپس جانے دیجئے اور شاید مولانا نے فوراً اس سے اتفاق کر لیا۔ اس پر بیٹی نے کسی قدر آزردگی کا خط لکھا تو اس کے جواب میں مولانا کہتے ہیں :۔

فاطمہ! نہ میرا پہلے خیال تھا۔ نہ اب ہے کہ تم کو جلد رخصت کروں[1]۔ تمہارا علاج سب سے مقدم ہے۔ تم نے خود ہی لکھا تھا کہ مجھ کو دو چار دن میں جانے دیجئے۔ اس پر میں نے لکھ دیا تھا۔

میری طبیعت اب تک اچھی نہیں۔ ورنہ تم سے خود آ کر یہ باتیں کہتا۔

دوسرا رقعہ اس سے ایک ہفتہ بعد کا ہے :۔

عزیزی، گھبراؤ نہیں۔ فاطمہ! میں کیا بتاؤں، میرے دل کو کیا قلق ہے۔ خیر ایسے خیالات دل میں نہ لاؤ۔ تمہاری بیماری تکلیف دہ ہے لیکن مہلک نہیں۔

افسوس، کہ مولانا کی تسلیاں طفل تسلیاں ثابت ہوئیں۔ کیونکہ مریضہ کی حالت اصلاح پذیر نہ ہوئی اور وہ بندول چلی گئی۔ اگلے مہینے مولانا نے بھی بمبئی کا رُخ کیا۔ ان کا تیسرا خط اس وقت لکھا گیا جب وہ جنجیرہ میں مقیم تھے اور عطیہ بیگم کی ہمشیرہ زہرہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس خط میں بیٹی کی بیماری پر افسوس کا اظہار کر کے لکھتے ہیں :۔

---

[1] شاید حالتِ بیماری میں ہی اپنی بیٹی کو جلد واپس بھیجنے پر مولانا اس لئے آمادہ ہو گئے کہ ان دنوں عطیہ بیگم صاحبہ سے شرفِ ملاقات کے لئے وہ جنجیرہ جانے کے لئے بیتاب تھے۔ بیٹی کے نام ان کا یہ رقعہ ۲۹ر جولائی کا ہے اس سے چار روز پہلے عطیہ بیگم کو ایک خط لکھ چکے تھے۔ "زبانی شکریہ جنجیرہ آ کر ادا کروں گا۔"

خدا نے چاہا تو لکھنؤ پہنچ کر سب سے پہلے بندول آؤں گا۔ ابھی چند روز اور سفر میں گزریں گے۔

یہ خط ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء کا ہے۔ پتہ نہیں جس وقت مولانا سفر سے واپس آئے۔ اس وقت تک فاطمہ خانم زندہ تھیں اور باپ بیٹی کی اس کے بعد ملاقات ہو سکی یا نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ باپ کی اس لاڈلی نے اسی سال دنیا کو خیر باد کہا[1]۔ اور اُس کی وفات کے وقت مولانا اس کے پاس موجود نہ تھے[2]۔

شبلی کے خطوں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اہل و عیال کو ایک جنجال سمجھتے تھے۔ اپنی دوسری شادی کے دو سال بعد نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

زنانہ کا الگ بکھیڑا ہے۔

لیکن اس سے بھی زوردار اظہار امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی اہلیۂ محترمہ کے متعلق ہے۔ ایک خط میں مولوی عبدالباری ندوی کو لکھتے ہیں:-

آزاد کا (کیا) ٹھکانہ۔ وہ کشمیر جائیں تو زنانہ کو کیا کریں۔ یہ بلا ان کے ساتھ ہے۔

شاید بعض لوگوں کو مولانا کا یہ طرزِ کلام سرد مہری بلکہ بے مہری کا اظہار معلوم ہو اور اس میں بھی کلام نہیں کہ سوائے مولوی محمد اسحٰق کے جو ع

قوتِ دست و دلِ شبلی نعمانی تھا

---

[1] سید سلیمان نے فاطمہ خانم کی وفات کا مہینہ نہیں دیا۔ صرف سال (۱۹۰۹) لکھا ہے صفحہ ۷۲۵ [2] حیاتِ شبلی ص ۷۷۸

شبلی کا اقارب و اعزہ سے کسی خاص مہر و محبت کا سلوک نہ تھا لیکن ان کے اس طرز عمل میں بھی ایک رمز و حکمت پنہاں تھی۔ مولانا شبلی سمجھتے تھے کہ اہل و عیال کی ذمہ داریوں سے قومی کاموں کی بجا آوری میں خلل پڑتا ہے وہ ایک خط میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں :۔

خاندان سے زیادہ ترچسپیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں۔ مہمات امور رک جاتے ہیں۔

شبلی نے اولاد سے جو سرد مہری برتی۔ یا زنانہ کے لئے بکھیڑا اور بلا کے الفاظ استعمال کئے۔ اس پر ممکن ہے۔ ان کے اہل و عیال کو شکایت کا حق ہو لیکن کم از کم قوم کو، جس کے لئے وہ خاندانی دلچسپیاں پس پشت ڈال رہے تھے کسی شکایت کا حق نہیں بلکہ اس سے تو شبلی کے ایثار اور انہماک کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے والد سے خفا ہو کر چلے جانے کے بعد حامد صاحب اوائل مئی سن ۱۹۰۰ء میں بہار شریف سے واپس آئے لیکن اس دوران میں شبلی کے نکاح کی تاریخ آئی اور چلی گئی۔ لڑکی والوں کے ہاں ان کے مہمان وغیرہ آئے ہوئے تھے اور منتظر تھے کہ نکاح کی تاریخ کو برات آئے گی۔ اعظم گڑھ میں بھی لوگ مولانا سے یہ کہتے تھے کہ نکاح کی تاریخ نہیں ٹالنی چاہئے لیکن ان کی طبیعت اس وقت اپنے قابو میں نہ تھی۔ وہ نہ مانے۔ اور تاریخ معینہ پر کوئی برات نہ گئی۔ لڑکی والوں کی، بقول شبلیؒ "بہت خفگی ہوئی"۔ لیکن لڑکی کے بھائی مولانا محمد سمیع، مولانا کے بچپن کے دوست بلکہ عاشق زار تھے۔ انھوں نے بات کو بگڑنے نہ دیا۔ وہ اعظم گڑھ آئے۔ اور اس بات پر بھی راضی ہو گئے کہ اعظم گڑھ میں ہی نکاح ہو جائے۔

لیکن شبلی اس کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ البتہ یہ کہہ کر زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا۔

حامد شبلی واپس آئے تو نکاح کی تیاری شروع ہوئی اور اگلے مہینے، جون ۱۹۰۰ء میں یہ فریضہ ادا ہوا۔

مولانا کی شادی خانہ آبادی ان مزاحمتوں کے بعد سرانجام[۵] پا گئی لیکن معلوم ہوتا ہے۔ خانۂ دل بدستور غیر آباد رہا۔ ان کی خواہش تھی کہ جو آئے، سیرت اور صورت، دونوں میں بے نظیر ہو لیکن یہ ارمان پورے نہ ہوئے۔ چنانچہ اب اُنھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ کم از کم بیوی کو تعلیم دے کر اس کے حسنِ سیرت کا انتظام کیا جائے۔ یہ اہتمام ان کی بیٹی کے سپرد ہوا اور ساتھ ہی مولانا نے دُلہن کے بھائی، مولوی محمد سمیع کو ایک پژمردگی سے بھرا ہوا خط لکھا:۔

تم جانتے ہو کہ حسنِ صورت کی نوبت ہو چکی۔ میری قسمت میں دونوں کا اجتماع نہ تھا۔ اب کوئی چیز مایۂ تسکین ہو سکتی ہے تو صرف حسنِ سیرت ہے۔ اس کے لئے

۵؎ ملاحظہ ہو۔ حیاتِ شبلی ص ۲۵۰ وغیرہ۔ پتہ نہیں۔ مولوی محمد امین زبیری، خطوطِ شبلی (طبع ثانی) کے دیباچہ میں کس بنا پر کہتے ہیں۔ "بیوی کے انتقال کے بعد الٰہی جگر بندیوں کے خوف سے اُنھوں نے عقدِ ثانی نہیں کیا اور جب بزرگوں اور دوستوں کے مجبور کرنے پر راضی ہوئے تو خاندان کی قید کو توڑ کر مولانا محمد علی مرحوم ناظم ندوہ نے اپنے ایک ہم سبق دوست کی لڑکی تجویز کی جس کو خدا نے صوری و معنوی خوبیاں عطا کی تھیں اور جس نے فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن مولانا ہی کے احباب میں ایک ذی ثروت اور ذی مرتبت دوست اس جنس نفیس کے خریدار بن گئے اور مولانا نے عقدِ ثانی کا خیال ہی چھوڑ دیا۔" یہ واقعہ یا تو دوسری بیوی کی وفات کے بعد رونما ہوا ہو گا جو ۱۹۰۵ء میں چل بسیں یا عقدِ ثانی سے پہلے لیکن عقدِ ثانی ضرور ہوا۔

سب سے مقدم تعلیم ہے۔

شادی کتخدائی سے فارغ ہو کر مولانا علمی کاموں میں ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے کہ ان پر ایک اور مصیبت آئی۔ اب ان کے والد شیخ حبیب اللہ کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ صدمے بھی انھوں نے بہت سہے تھے۔ بالخصوص لائق نوجوان بیٹے مہدی کی جس سے ان کی سب امیدیں وابستہ تھیں۔ وفات نے انھیں بہت دھکا لگایا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ وہ طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوئے تھے سنہ ۱۹۰ء کے آخر میں وہ پھر بیمار ہوئے۔ نومبر میں ان کی حالت بہت خراب ہوئی اور بالآخر وہ ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۰۱ء کو وفات پا گئے

شبلی کو والد کی وفات کا بڑا صدمہ تھا۔ چنانچہ اس موقع پر انھوں نے ایک فارسی مرثیہ لکھا جو اگرچہ کسی وجہ سے دیوان مرتب کرتے وقت شامل دیوان[1] نہیں ہوا لیکن جواب برگِ گل میں چھپ گیا ہے۔ والد کی زندگی میں شبلی کو ان کے ساتھ کئی غلط فہمیاں اور بعض حقیقی اختلافات رہے تھے لیکن ان کی وفات پر شبلی نے بڑی ہمت اور صحیح فرزندانہ سعادت سے کام لیا۔ ان کے والد نے تھوڑی نقدی اور بہت سا قرض چھوڑا تھا اور جائداد کا جزو غالب شبلی کی سوتیلی ماں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ جب شیخ حبیب اللہ نے یہ جائداد اپنی دوسری بیوی کو منتقل کی تھی تو یہ امر شبلی کو بہت ناگوار گزرا تھا اور رجب ۱۸۹۲ء میں

---

[1] سید سلیمان نے شبلی کے فارسی دیوان کی نسبت ایک خط کی بنا پر لکھا ہے کہ یہ ۱۸۹۳ء میں طبع ہوا لیکن نامی پریس والے دیوان میں سنہ ۱۹۰۱ء کا ترکیب بند بھی ہے۔ اور سرورق پر شبلی کو "ناظم سررشتۂ علوم و فنون آصفیہ" بتایا گیا ہے لیکن تاریخ نہیں ہمارا خیال ہے۔ کہ یہ دیوان سنہ ۱۹۰۲ء سے پہلے نہیں شائع ہوا۔

کوشش ہوئی کہ ایک اقرار نامہ کی رو سے معاملہ سدھر جائے تو اگرچہ شبلی کے بھائی مہدی والد کے ہم خیال تھے اور دوسرے بھائی مولوی محمد اسحق بھی متفق ہو گئے تھے لیکن شبلی نے اسے قبول نہ کیا وہ اپنے بھائی مولوی محمد اسحق کو اپریل ۱۸۹۲ء میں لکھتے ہیں۔

..... ہم لوگ اس وقت تک کسی جائداد کے مالک نہیں ہیں۔ کیونکہ والدہ کا ہبہ محض فضول ہے اور تقسیم نامۂ اخیر میں ہم لوگوں کو خود کچھ نہیں دیا گیا بلکہ براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو.....

اصل یہ ہے کہ اگر والد قبلہ کو اور زیادہ تر کانٹوں میں الجھانا ہے تو وہ جس قدر چاہیں الجھائیں لیکن اگر صفائی سے کوئی معاملہ کرنا ہے تو اس کی صرف یہ تدبیر ہے کہ جس قدر حصہ زائد فریق سوم کو دیا گیا ہے وہ بذریعہ بیع کے فریق دوم کی طرف رجوع کرے اور فریقِ دوم کا اصلی حصہ بذریعہ ہبہ نامہ منتقل۔ منتقل کیا جائے اس کے سوا اور سب تدبیریں سترباغ ہیں جس کو میں بہت کچھ دیکھ چکا ہوں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ یہ تدبیر نہ والد قبلہ کو منظور ہے۔ نہ ارباب چھاؤنی کو اور سب سے زیادہ میاں مہدی کو لیکن یہ حالت ہے تو نمائش سے کیا فائدہ ہو چکا۔ ہو چکا۔ فریق دوم کچھ نالش فریاد نہیں کرتا۔ بے فائدہ فکر کیوں کی جاتی ہے۔

شیخ حبیب اللہ کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو قرضے کی رقم اور ان مناقشات کا، جو نکاحِ ثانی کا عام ثمرہ ہیں، سامنا کرنا پڑا لیکن شبلی کی ہمت و سعادت مندی اور ان کی سوتیلی والدہ کی شرافت اور دریا دلی سے سب مشکلات حل ہو گئیں۔

"باپ کی زندگی بھر سولا نا سوتیلی ماں سے ملنا کیا معنی نام سے بیزار تھے ان کا ذکر سننا نہیں چاہتے تھے مگر باپ کی وفات کے بعد یہ انقلاب ہوا کہ وہ خود چھاؤنی میں جہاں وہ رہتے تھے۔ تشریف لے گئے۔ ماں کے قدموں پر

بگرے۔ عمر بھر کی معافی مانگی اور ایسی سعادتمندی دکھائی کہ اپنے بیٹے سے بھی ممکن نہیں۔" مولانا کی والدہ نے مولانا کا حُسنِ سلوک دیکھ کر جو کیا وہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ اُنھوں نے وہ جائداد جو انھیں شیخ صاحب ہبہ کر گئے تھے۔ واپس کر دی۔ یہ جائداد قرضخواہوں کو دے دی گئی اور قرض کا جزوِ غالب ادا ہوا جو کچھ باقی رہ گیا تھا اسے مولانا نے حیدر آباد کی ملازمت میں بیباق کر دیا۔

علی گڑھ چھوڑنے کے دو تین سال بعد تک شبلی نہ صرف ذاتی اور خاندانی مشکلات میں مبتلا رہے بلکہ علمی حیثیت سے بھی کچھ نہ کر سکے۔ علی گڑھ چھوڑ کر ان کا ارادہ ندوہ میں قیام کا تھا اور علالت کے دوران میں وہ کچھ زمانہ ندوہ کے مکان میں مقیم رہے لیکن وہاں انھوں نے دیکھا کہ ان کے اور ندوہ کے اربابِ حل و عقد کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے۔ ۱۸۹۹ء میں اُنھوں نے دارالعلوم میں انگریزی پڑھائے جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ منظور نہ ہوئی اس کے علاوہ ندوہ پر کچھ اس طرح کا زمانہ آیا ہوا تھا کہ شبلی جو بڑے ذکی الحس ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے محتاط بھی تھے۔ اس امر کو خلافِ مصلحت سمجھتے تھے کہ وہ اس زمانے میں اپنے آپ کو ندوہ سے وابستہ کریں، اس وقت صوبجات متحدہ کے گورنر سر انٹونی میکڈانلڈ اور تھے۔ انھیں مسلمانوں اور اسلامی اداروں سے ویسے ہی غیر معمولی دلچسپی تھی اور ندوہ بر خاص نگہِ کرم کرنے کا سبب یہ ہوا کہ ندوہ کے کسی مسلمان مخالف نے ان تک ندوہ کی سیاسی روش کے خلاف شکایتیں پہنچائیں جناب ندوہ کی طرف سے بدگمانی کا آغاز ہوا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ برطانوی ہندوستان کو چھوڑ دیا۔ منشی اطہر علی صاحب مرحوم حیدر آباد چلے گئے۔ ندوہ کے ناظم اور روحِ رواں مولانا سید محمد علی صاحب بھی سنہ ۱۹۰۰ء میں

حجاز تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی قائم مقام ہوئے۔ مگر انھوں نے قیام دہلی ہی میں رکھا پھر بعد کو وہ بھی ایک ہی سال کے اندر مستعفی ہوگئے۔"

مولانا شبلی نے ابھی ندوہ میں قیام نہیں کیا تھا بلکہ وہ دو آخری سالانہ جلسوں میں بھی شریک نہ ہوئے تھے لیکن وہ ندوہ کے رکنِ رکین گنے جاتے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ ان کی طرف بھی اربابِ حل و عقد کی مشتبہ نظریں اٹھتی ہونگیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی برطانوی ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

" فروری سنہ ۱۹۰۱ء میں دفعتاً وہ اعظم گڑھ سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے یونہی غازی پور کا ٹکٹ لیا۔ وہاں سے علی گڑھ کا رُخ کیا اور نواب محسن الملک سے مشورے کے بعد حیدرآباد روانہ ہوگئے۔"

حیدرآباد پہنچ کر مولانا پہلے مولوی عزیز مرزا کے ہاں مقیم ہوئے جو وہاں ہوم سکریٹری تھے۔ پھر مولوی سید علی بلگرامی کے ہاں اٹھ گئے۔ حیدرآباد سے مولانا کے تعلقات پُرانے تھے۔ ان کی آمد پر علم و ادب کے حلقوں میں بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا اپریل سنہ ۱۹۰۱ء کو ان کے لئے صیغہ امورِ مذہبی کا ایک عہدہ جس کا ماہوار مشاہرہ ۲۵۴ روپے تھا تجویز ہوا لیکن مولانا نے اسے قبول نہ کیا اور بالآخر ۲۲ مئی سنہ ۱۹۰۱ء کو ان کا تقرر سررشتہ علوم و فنون کی نظامت پر ہوا۔ اس محکمہ کا مقصد اردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچانا تھا۔ مولوی سید علی بلگرامی اس سررشتہ کے نگران تھے اور ان ہی نے مولانا کا انتخاب کیا اس تقرر کی وجہ سے نہ صرف مولانا کی مالی مشکلات کا بار ہلکا ہوگیا بلکہ انھیں تصنیف و تالیف کا بھی اچھا موقع ملتا رہا اور ساڑھے تین سال

کے قیام میں انھوں نے کوئی پانچ کتابیں مکمل کیں۔

علی گڑھ آنے سے پہلے شبلی کی علمی کوششیں شعرگوئی اور مناظرانہ رسالوں تک محدود تھیں۔ وہاں پہنچ کر انھیں علمِ تاریخ کا شوق پیدا ہوا اور ان کی تاریخی اور سوانحی تصانیف کا جزوِ غالب وہیں لکھا گیا۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم اور دوسرے تاریخی رسائل کے علاوہ المامون۔ النعمان قیامِ علی گڑھ کے دوران میں شائع ہوئیں اور الفاروق بھی قریب قریب ساری کی ساری اسی زمانے میں مکمل ہوئی۔

حیدر آباد پہنچ کر مولانا کا تصنیفی محور پھر بدل گیا۔ یہاں زیادہ تر کلامی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں ایک تو علم الکلام کی تاریخ (علم الکلام) اور دوسری (الکلام) جدیدِ علم کلام کے متعلق ہے۔ مولانا پر اس زمانے میں یہ رنگ اتنا غالب تھا کہ انھوں نے غزالی اور رومی کی سوانح عمریوں (الغزالی اور سوانح مولانا روم) کو بھی علم الکلام کی کتابیں بنا دیا اور ان میں زیادہ تر کلامی مباحث سے بحث کی۔ الغزالی سرسید کے ایما پر شروع ہوئی۔ وہ الفاروق لکھے جانے کے حق میں نہ تھے۔ انھیں اٹھارویں صدی اور شاہانِ اودھ کا وہ زمانہ یاد تھا جب شیعہ سنی مسئلے نے قوم کا اجتماعی نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ انھوں بڑی مشکل سے دونوں فریقوں کو اپنی خوشی سے مل کر کام کرنے کا طریقہ بتایا تھا اور وہ ہر ایسی چیز سے ڈرتے تھے۔ جس سے پرانی تلخ بحثیں تازہ ہونے کا امکان ہو۔ وہ ابھی الفاروق اور العلی لکھے جانے کے حق میں نہ تھے اور انھوں نے شبلی کو الفاروق کے بجائے الغزالی لکھنے کا مشورہ دیا۔ شبلی نے اس وقت تو یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ لیکن جب الفاروق سے فارغ ہوئے تو الغزالی لکھنے کا خیال آیا۔ اس وقت ان پر

کلامی اور معتزلی رنگ چھایا ہوا تھا چنانچہ انھوں نے الغزالی کو بھی اپنے کلامی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مولانا شبلی مہدی حسن کو جنھوں نے الغزالی کی تشنگی کی شکایت کی تھی۔ لکھتے ہیں:۔

بے شبہ غزالی کو بہت کچھ سمیٹا ہے اور اس کے چند در چند اسباب جمع ہو گئے۔ ایک تو وہی کہ ع

رکھوں کچھ اپنی بھی میں چشم خونفشاں کے لئے

دوسرے حیدرآباد میں رہ کر زیادہ پھیلنا ممکن نہ تھا۔ بے شبہ یہ اخلاقی کمزوری ہے لیکن ضروریاتِ زندگی چند روز تک یہاں رہنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ دوسرے ایڈیشنوں میں اس کی تلافی کا موقع باقی رہتا ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں الغزالی پہلا زینہ ہے دوسرا تاریخ علم الکلام پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے جو زیر تصنیف ہے..... غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علما برسوں، بلکہ قرنوں کے لئے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں بلکہ ع میں تو ڈوبا ہوں......

افسوس کہ مولانا نے الغزالی میں اپنے موضوعِ تصنیف کا حق ادا نہیں کیا۔ یوں تو ان کی حیدرآباد کی ساری تصانیف پر ایک بے جان تکلف چھایا ہوا ہے لیکن غزالی اور مولانا روم کی سوانح عمریوں سے خاص طور پر مایوسی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی کو ابتدائی تربیت نے ایک کٹر معقولی بنا دیا تھا۔ ان کی تصانیف کی منطقی ترتیب سے انکار نہیں عام معقولیوں کی طرح ان کی ظواہر پر پوری نظر تھی اور ان کی طرزِ تحریر میں

ایک پوچ اور نفاست ہے لیکن نظر کی وہ گہرائی باطن کی وہ پاکیزگی۔ دل کی وہ گداختگی جو دہلی اور دیوبند کے محدثین کا عطیہ تھی۔ ان سے پورب کا یہ معقولی محروم رہا وہ غزالی میں بھی سب سے پہلے کلامیات کو ڈھونڈتے ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا شروانی کو تصنیف کے چند موضوع بتائے تھے۔ ان میں ایک امام غزالی کی سوانح عمری تھا۔ لکھتے ہیں:-

امام غزالی کی لائف جس میں علمِ کلام پر پورا ریویو ہوتا۔ کیونکہ موجودہ علمِ کلام کے موجد وہ ہیں۔

چنانچہ الغزالی میں کلامیات کی بوچھاڑ ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ شروع میں تصوف اور روحانیت جو غزالی کی زندگی کے سب سے اہم اور نمایاں پہلو ہیں۔ ان کا بھی کتاب میں ذکر نہ تھا۔ "ایک دوست کی توجہ دلانے سے انھوں نے امام ممدوح کی صوفیت کا مطالعہ کرکے ایک باب الغزالی میں اضافہ کیا۔" اب حالت یہ ہے کہ اگرچہ شبلی کے قلم سے جو کچھ بھی نکلا ہے۔ بیش بہا ہے۔ ان کی ادھوری اور سرسری کوششیں بھی ادبِ اردو کا تاج ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ الغزالی ایک کامیاب سوانح عمری نہیں اور اس سے اردو دان طبقے کو اسلامی تاریخ کی اس عظیم الشان ہستی سے جس کی روحانی کشمکش کا مطالعہ مادیات اور روحانیات کے موجودہ ظواہر پسند دور میں خاص طور پر ضروری ہے۔ کما حقہٗ روشناس ہونے کا موقع نہیں ملا۔

کلامیات سے شغف کے علاوہ قیامِ حیدرآباد میں مولانا کو خالص ادبی الغزالی سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ علی گڑھ آنے سے جب الفاروق سے وہ کثرت سے لکھا کرتے تھے۔ علی گڑھ آنے کے بعد ان کی

شاعری کا محور بدل گیا اور غزلوں کی جگہ قومی نظموں نے لے لی۔ وہ حیدرآباد گئے تو جہاں اسلامی تاریخ کی جگہ کلامیات کا نشہ طاری ہوا۔ وہاں غزل گوئی کا پرانا شوق بھی عود کر آیا۔ حیدرآباد میں اس وقت داغ، شرر۔ مولوی عزیز مرزا۔ مولوی ظفر علی خاں۔ مولوی عبدالحق اور دوسرے ادب کے دلدادہ موجود تھے۔ داغ سے شبلی کو خاص طور پر عقیدت تھی۔ سید سلیمان لکھتے ہیں۔ "داغ کے سینکڑوں اچھے شعر ان کی زبان پر تھے"۔ چنانچہ اس ماحول میں ان کا ابتدائی ذوق پھر ابھر آیا اور انھوں نے کئی اردو غزلیں لکھیں۔ افسوس کہ یہ غزلیں محفوظ نہیں رہیں لیکن انھوں نے ایک خط میں جو چند شعر درج کئے ہیں۔ ان سے اس زمانے کے رنگِ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے ؎

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رُخ کیا زمیں کا

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو "ہاں" بھی ہوگی ابھی تو سِن ہے "نہیں" "نہیں" کا

یہ نظم آئیں، یہ طرز بندش، سخنوری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرزِ علی حزیں کا

موازنہ انیس و دبیر کا بیج بھی ان ہی ادبی صحبتوں میں بویا گیا اور بمبئی سے تعلق کا آغاز بھی، جو شبلی کی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والا تھا۔ قیامِ حیدرآباد کے دوران میں ہوا۔ وہ حیدرآباد آتے جاتے یا حیدرآباد سے آکر گاہے گاہے بمبئی دیکھتے ہوں گے اور یہاں کے دیدہ افروز مناظر سے متاثر ہوتے ہوں گے۔ مثلاً جب ۱۹۰۴ء میں آرنلڈ صاحب ہندوستان چھوڑ کر

ولایت گئے۔ تو انھیں الوداع کہنے مولانا بمبئی آئے تھے اور ایک تحفہ بھی ساتھ لائے تھے۔

ادب اور بالخصوص اردو ادب سے ان دنوں شبلی کی دلچسپی بڑھ جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اس وقت انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ یہ انجمن فی الحقیقت ان کوششوں کا نتیجہ تھی جو نواب محسن الملک اور دوسرے حامیان اردو، سر انٹونی میکڈانل اور ہندی پسند ہندوؤں کے حملوں سے اردو کو بچانے کے لئے کر رہے تھے۔ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء میں جب یو۔ پی میں ایک ایسا فرمان جاری ہوا۔ جسے اردو کے حامیوں نے اپنی زبان کیلئے سخت مضر سمجھا تو نواب محسن الملک نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی اور اس سلسلے میں لکھنؤ میں ایک زبردست تقریر کی۔ سر انٹونی میکڈانل کی شدید مخالفت سے یہ کوششیں تو سرسبز نہ ہوئیں لیکن جب میکڈانل صاحب چلے گئے اور حالات زیادہ سازگار ہوئے تو نواب محسن الملک نے اردو کی ترقی کے لئے پھر ایک ادارہ قائم کرنا چاہا اور سنہ ۱۹۰۳ء کے شروع میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک صیغے کے طور پر انجمن ترقی اردو کا آغاز ہوا۔

جن لوگوں نے گذشتہ بیس پچیس سال میں، بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے زیر عنان، انجمن کی کارگزاریاں دیکھی ہیں جنھوں نے انجمن کو ایک اچھی خاصی حکومت کا ایک سرگرم صیغہ بنا دیا ہے اور اس گئے گزرے زمانے میں بھی دکھا دیا ہے کہ وہ کون سی انتظامی قابلیت۔ عملی سوجھ بوجھ اور بلند ہمتی تھی جس کی بدولت مسلمانوں نے کئی سو سال اس ملک میں حکومت کی تھی۔ انھیں تو مولانا شبلی کا ابتدائی کام بالکل معمولی نظر آئے گا۔ لیکن وہ کام کا آغاز تھا اور شبلی نے ایک دو سال کی نظامت میں جو کچھ

کیا وہ ان کی خوش تدبیری اور اردو سے محبت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ظاہری حیثیت سے حیدرآباد میں شبلی کی حالت بہت اچھی تھی۔ علی گڑھ میں انھیں سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ یہاں چار سو۔ تصنیف و تالیف کے لئے بھی وقت تھا۔ صحبت بھی باکمال اور با مذاق لوگوں کی تھی لیکن شبلی کے خطوط پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک سخت ذہنی خلفشار اور کشمکش کی وجہ سے وہ ایک کانٹوں کی سیج پر لوٹتے رہے۔ اس میں کسی حد تک تو ان کے مزاج کو دخل تھا جو اعصابی کمزوری اور طبعی سوداویت کی وجہ سے اب آہستہ آہستہ زیادہ چڑچڑا ہو رہا تھا لیکن حیدرآباد کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ شبلی کو سکون ملنا محال تھا۔

جس وقت حیدرآباد میں ان کی ملازمت کا معاملہ درپیش تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کی طبیعت اور علمی ذوق کا تقاضا تھا کہ وہ ملازمت کی زنجیروں میں نہ پھنسیں اور دنیوی حالات اس تعلق پر مجبور کر رہے تھے۔ ۷ اپریل کا ایک خط ہے :۔

> میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر۔ ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہونا ہے۔

اس کے چند روز بعد، جب ابھی ان کی ملازمت کا فیصلہ نہ ہوا تھا۔ اپنے سالے کو لکھتے ہیں :۔

> بہر حال دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بے شبہ اگر ملازمت کر سکتا اور کسی قدر دنیاداری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے لیکن میاں سمیع عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا۔ چند برسوں کے لئے دامنِ زندگی کو کیا آلودہ کروں دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی۔ بلند ہی رہے "

اس کے چند روز بعد اُنھوں نے اپنے عہدے کا چارج لیا۔ لیکن ذہنی کشمکش اب بھی قائم رہی۔ فرماتے ہیں :۔

میں یہاں آکر ایسا پھنس گیا کہ ع

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ہمت کہتی ہے۔ ع بے تامل آستیں افشاندن از دنیا خوش است

مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد واقعات ایسے آئے جنھوں نے ان کے سکون و اطمینان کو اور درہم برہم کر دیا۔ شبلی کو ملازمت مولوی سید علی بلگرامی کی مدد اور مدار المہام نواب وقار الامرا کی عنایت سے حاصل ہوئی تھی لیکن ریاستوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ اس ملازمت کی تفویض کے چند ماہ بعد نواب وقار الامرا مدار المہامی سے مستعفی ہو گئے اور مولوی سید علی بلگرامی کو ریاست نے سبکدوش کر دیا۔ شبلی ان کے متوسلین میں سے تھے ان کی ملازمت بھی معرض خطر میں پڑ گئی۔ ۲۷ اگست کو شروانی کو لکھتے ہیں :۔

"حیدر آباد کی پولٹیکل سرزمین میں سخت بھونچال آیا۔ وزارت کا قبلہ مشرق سے مغرب کو بدل گیا .... ہاں میں نے نظامت علوم و فنون قبول تو کرلی ہے لیکن اس انقلاب میں دیکھئے۔ یہ خدمت بھی مجھے قبول کرتی ہے یا نہیں۔ چند روز بعد کا خط ہے۔

انقلاب حال نے تمام اُمیدیں خاک میں ملا دیں۔ اب ایام گذاری ہے۔

پھر ۱۰ اکتوبر کو ان ہی کو لکھتے ہیں :۔

یہاں ہر روز ایک نیا شگوفہ کھلتا ہے۔ سید علی نکل چکے اور لوگ نکالے جاتے ہیں۔ میرا بھی نفس باز پسیں ہے۔

اسی زمانے کا سمیع صاحب کے نام خط ہے :۔

یہاں کے حالات غالباً تم نے اخباروں میں پڑھے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ دنیا ادھر کی ادھر ہوگئی۔ مولوی سید علی وغیرہ نکلے اور بقیہ نکلتے جاتے ہیں۔ میں بھی دو چار روز کا مہمان ہوں۔

شبلی نے دنیوی ترقی کے جو خواب دیکھے تھے۔ انھیں وزارت کے انقلاب نے درہم برہم کر دیا۔ لیکن شبلی کے دوسری پارٹی سے بھی تعلقات تھے اور نواب وقار الامرا کے جانشین مہاراجہ کشن پرشاد ان کے قدر دان تھے۔ ان کی ملازمت قائم رہی۔ البتہ اس کی ضرورت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک کمیشن بٹھا دیا گیا۔ مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں :۔

میں اچھا ہوں۔ مگر پریشان ہوں۔ یہاں برسوں میں ایک چیز کا فیصلہ ہوتا ہے۔ میرے سررشتہ اور دائرۃ المعارف پر ایک کمیشن بیٹھا ہے۔ اس کی رپورٹ پر فیصلہ ہوگا لیکن پہلے بھی یہاں کی سازشوں سے سخت گھبرا گیا ہوں۔

چند روز بعد کا ایک خط ہے :۔

میرے حالات اب یہاں بہت خراب ہیں۔

اس کشمکش نے مولانا کو سخت بددل کر دیا اور ندوہ کے قیام کا ارادہ اور مضبوط ہو گیا۔ چنانچہ اس دوران میں مولانا نے ندوہ کے سالانہ جلسے میں باقاعدہ اعلان کروا دیا کہ وہ ندوہ میں شریک ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد ان کے حیدر آباد میں حالات بہتر ہو گئے اور وہ سوچنے لگے کہ اگر ہو سکے تو حیدر آباد میں ہی بیٹھ کر ندوہ کی خدمت کی جائے۔ وہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، کو جو ان کے حیدر آباد چھوڑنے اور ندوہ آنے پر مصر تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

ندوہ میں جو لوگ میرے خلاف ہیں۔ ان میں خود میرے ہم وطن اور عزیز بھی ہیں جس وجہ سے خلاف ہیں۔ اس سے بھی میں واقف ہوں۔ لیکن ان باتوں کی طرف توجہ کرنے سے کیا حاصل۔ آپ سے البتہ تعجب ہے کہ ہر قسم کے کام کرنے کے لئے ترکِ معاش کی شرط کو ضروری قرار دیں۔

یہ خط ستمبر ۱۹۰۲ء کا ہے۔ اس کے بعد خطوط میں حیدر آباد چھوڑ کر ندوہ جانے کا ذکر بہت کم ہے۔ مولانا کی نسبت کمیشن نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کا محکمہ توڑ دیا جائے لیکن پھر یہ معاملہ کونسل میں گیا اور مدار المہام مولانا کے حیدر آباد رہنے کے حق میں تھے۔ مولانا اس کشمکش میں تھے کہ انھوں نے اخبارات میں کسی ہندو انجمن (سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی ؟) کی تاسیس اور ہندوؤں کے ایثار کا حال پڑھا۔ اس سے ان کے ولولے پھر تازہ ہوگئے اور انھوں نے ۱۹۰۴ء میں کوشش شروع کی کہ ان کا پرانا تصنیفی وظیفہ جاری ہو جائے اور موجودہ ملازمت سے استعفےٰ قبول ہو۔ ستمبر ۱۹۰۴ء میں وہ حالات کو بچشم خود دیکھنے کے لئے لکھنؤ گئے اور ندوہ میں چند روز کے قیام کے بعد قطعی فیصلہ کیا کہ حیدر آباد چھوڑ دیں۔ اور ندوہ میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء کے شروع میں انھوں نے حیدر آباد کو خیر باد کہا۔ اور ندوہ میں اقامت اختیار کی ؛

ندوۃ العلوم لکھنؤ

(۱)

۱۹۰۵ــــ۱۹۰۸

مولانا شبلی ندوہ میں ۱۹۰۵ء کے شروع میں آئے لیکن ندوہ کے نصاب تعلیم کی ترمیم اور ندوہ کی عام اصلاح کے متعلق ان کی کوششیں حیدرآباد سے ہی جاری تھیں۔ وہ ۱۸۹۹ء، ۱۹۰۰ء، ۱۹۰۱ء کے سالانہ جلسوں میں شامل نہ ہوئے تھے اور ندوہ سے دور رہنے میں گورنر کے سیاسی، شبہات کو بھی دخل تھا لیکن اس مشکل کو نواب محسن الملک نے حل کر دیا۔ وہ اگست ۱۹۰۲ء میں گورنر سے ملے شبلی کے متعلق اس کے تمام شبہات رفع کئے اور گورنر سے مشورے کے بعد مولانا کو لکھا کہ آپ علی گڑھ آجائیے کالج سے بھی سو روپیے ملیں گے حیدرآباد کا وظیفہ بھی جاری ہو جائے گا۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا۔ جب شبلی نے حیات جاوید کے خلاف نجی خطوط میں نہایت جلے کٹے فقرے لکھے تھے اور ان کے دل میں سرسید اور علی گڑھ کے خلاف ایک طرح کا ردعمل شروع تھا انھوں نے فیصلہ کیا کہ علی گڑھ کے بجائے ندوہ میں شریک ہوں۔

اس سال وہ ایک مدت کے بعد ندوہ کے سالانہ جلسے میں شریک ہوئے اور امرتسر میں وہ فارسی ترکیب بند پڑھا جسے ندوہ کا "منشور انتخابی" سمجھنا چاہیے۔ اس سے کئی سال پہلے انھوں نے ندوہ کے ایک ابتدائی جلسے میں "علما کے فرائض" (یا حقوق؟) پر ایک طویل تقریر کی تھی۔

جس میں ندوۃ العلما کے متعلق ان کے خواب بیان ہوئے تھے لیکن اس میں تعلیم کے قدیم اور جدید طریقوں پر طنز نہ تھا۔ امرتسر کے ترکیب بند میں دونوں پر اعتراضات ہیں اور ندوہ کی فوقیت بتائی گئی ہے جو ان دونوں کو ملانا چاہتا تھا۔ شروع میں تعلیمِ قدیم کا ذکر ہے اور چونکہ شبلی اس راہ کی تلخیاں خود اٹھا چکے تھے۔ ان کا ذکر بڑے موثر طریقے سے ہے ؎

درچنیں حادثۂ صعب کہ بر ما افتاد ۔۔۔ چارہ آں نیست کہ از عہدِ کہن داری یاد
چارہ آں نیست کہ بر رسمِ کہن طرح نہی ۔۔۔ مکتب و مدرسہ ہا در ہمہ اطراف و بلاد
تا چہ سود دہد آں شیوۂ تعلیمِ قدیم ۔۔۔ کہ بروئیت درِ رزقے نہ توانست کشاد
ایں نہ خواری بود آخر کہ پس از کسبِ علوم ۔۔۔ از رہِ وعظ بہ دریوزہ برآئی ناشاد
عامیاں را بفریبی و بہ صد حیلہ و فن ۔۔۔ آش و نانے بکف آری کہ شود توشۂ زاد
یا کہ با ہیچ خودے بحث و جدل سازدہی ۔۔۔ واں نزاعِ تو شود مایۂ ہر گونہ فساد
دستِ بالاست ہر آئینہ ز زیریں بہتر ۔۔۔ ایں حدیثِ نبوی ہست و ترا رفتہ زیاد
نبود وجہِ کفافِ تو مگر ہدیہ و نذر ۔۔۔ نبود حاصلِ بحثِ تو مگر کبر و عناد

خود بفرمائے اگر زیں مشغلہ مقصود چہ بود؟
گر وجودِ تو زیاں نیست بگو سود چہ بود؟

اس کے بعد نئی تعلیم والوں سے خطاب ہے ؎

اے کہ برمائدۂ یورپ مہماں باشی ۔۔۔ حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی
حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیاں ۔۔۔ منکرِ فلسفۂ سنت و قرآں باشی
مسمرازم شعبدہ جلوہ دہد سر بنہی ۔۔۔ منکرِ معجزۂ موسیٰ عمراں باشی
گفتۂ سولن و آئینِ جہانبانی او ۔۔۔ بر زباں داری و بیگانہ ز نعماں باشی
از ہنیبال صد افسانہ و دستاں گوئی ۔۔۔ جاہل از معرکہ ہائے شہِ مرداں باشی

تیغ‌ہا را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز | بے خبر از عمرؓ و حیدرؓ و عثمانؓ باشی

پھر ندوہ کا ذکر ہے ؎

دین و دنیا بہم آمیختن آساں نبود | گوئیا کشتی و گرداب دوچار افتاد است
نسبت فلسفہ و شرع بداں می ماند | کہ خزاں در عقب باد بہار افتاد است
حلِ ایں مشکل اگر خواہی از ندوہ بخواہ | اوکشا ید گرہے را کہ بکار افتاد است
حکمت و شرع در ینجا بہم آمیختہ اند | نمک و بادہ۔ دریں میکدہ یار افتاد است
عقل را نیست سرِ عربدہ ایں جا با نقل | پنبہ را آتش اینجا بہ شرار افتاد است

پتہ نہیں علی گڑھ اور دیوبند میں اس شاعرانہ طرزِ بیان کی نسبت کیا کہا گیا لیکن شیریں خوابوں اور زورِ انشا سے واقعات نہیں بدل جاتے۔ حقیقت یہ تھی کہ ندوہ خود ایک قدیم طرز کا مدرسہ تھا۔ مولانا نے قدیم طرزِ تعلیم پر جو اعتراض کئے تھے۔ ان کا جواب سب سے پہلے یہیں دیا گیا اور وہ بھی مولانا کے قدیم اُستاد مولانا محمدؐ فاروق چریا کوٹیؒ کی طرف سے!

سید سلیمان حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں :۔

مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی اس وقت دار العلوم میں مدرسِ اعلیٰ تھے وہ بھی امرتسر تشریف لے گئے تھے وہ واپس آئے تو شاگرد (مولانا شبلی) کے اس ترکیب بند کے ان چند شعروں سے بہت خفا تھے۔ جن میں فلسفۂ قدیم پر اور علما کی جدید فلسفہ سے بے خبری پر تعریض تھی۔

تا چہ سود دہد آں فلسفۂ عہدِ قدیم | تا چہ سود دہد آں ہیئتِ پارینہ نہاد
از عناصر سہ و شصت آمدہ اینک بہ شمار | تو ہماں در گرہِ آتش و آبستی و باد

ہم لوگ اس وقت مولانا فاروق صاحب سے فلسفہ و منطق کی چھوٹی

چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے۔ پھر بھی وہ ہم لوگوں کے سامنے بڑے جوش سے ان ۶۳ عناصر کے نظریہ کی تردید فرماتے تھے اور سمجھاتے تھے۔ اور خیال آتا ہے کہ اس کے جواب میں چند شعر بھی کہے تھے۔

شبلی سے مولانا فاروق کا اختلاف بڑا دلچسپ ہے۔ اس سے ایک تو اس قدیم پرور ماحول کا اندازہ ہوتا ہے جس میں شبلی کی دماغی ساخت معین ہوئی تھی۔ دوسرے اس فرق کا بھی پتہ چلتا ہے جو علی گڑھ کے قیام سے شبلی کے خیالات میں پیدا ہوا۔ اب شبلی وہی شبلی نہ تھا۔ جو اعظم گڑھ میں مولانا فاروق کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتا تھا بلکہ اس نے علی گڑھ میں سولہ برس گزارے تھے۔ قدیم کی شدید محبت جو اسے مولانا فاروق کے حلقۂ تلمذ میں حاصل ہوئی تھی۔ تمام عمر اس کے ساتھ رہی لیکن اب وہ جانتا تھا کہ قدیم کے استحکام اور بچاؤ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اصلاح اور ترمیم ہو اور جدید کی چند باتیں بھی اخذ کر لی جائیں۔ چنانچہ اس کے لئے شبلی نے قیام حیدرآباد کے دوران میں کوشش شروع کی۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو جو ندوہ کی مجلس نصاب کے ناظم تھے۔ بڑے پرزور اور باثر خط لکھے اور ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

۱۹۰۳ء کے شروع میں مجلس انتظامیہ نے مولانا کو اتفاق رائے سے ندوہ کے دارالعلوم کا معتمد بنانا قبول کر لیا تھا اور مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ لکھنؤ آکر قیام کریں۔ لیکن مولانا کوئی دو سال تک نہ آئے۔

مولانا کی ذہنی کشمکش اور طبعی تلون کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی تک اس امر کا بھی قطعی فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ وہ حیدرآباد چھوڑ کر

کہاں جائیں گے؛ ندوہ میں یا علی گڑھ میں؟ -

مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے کوئی تین مہینے بعد وہ حیدرآباد سے مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں :-

میں یہاں سے چھوٹا تو اعظم گڑھ نہیں بلکہ ندوہ میں رہوں گا۔ یا کالج میں۔

۱۹۰۴ء کے وسط اوّل میں علی گڑھ کی کشش زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ مئی ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں:-

سامان ایسے نظر آتے ہیں کہ علی گڑھ کے دام میں دوبارہ گرفتار ہوں۔ اگرچہ یہ وہ دام ہے کہ ؎

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

لیکن بالآخر قرعۂ فال ندوہ کے نام پڑا اور وہ ۱۹۰۵ء کے شروع میں باقاعدہ اس سے وابستہ ہوگئے۔

ندوہ کے نصاب کی اصلاح کے لئے امرتسر کے سالانہ اجلاس میں بعض اصول مرتب ہوئے تھے۔ پھر مدراس کے اجلاس (منعقدہ ۱۹۰۴ء) میں مولانا شبلی نعمانی مولوی عبدالحی ناظم ندوہ اور ملا عبدالقیوم حیدرآبادی کی ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ جسے نصاب بنانے کا اختیار دیا گیا۔ اس سب کمیٹی نے مولانا کی اکثر ترمیمات منظور کرلیں لیکن نئے نصاب پر عمل درآمد شروع ہونے دیر لگی اور جب تک مولانا نے حیدرآباد سے آکر ندوہ میں قیام نہ کیا اور نئے نصاب کو جبری طور پر شروع نہ کیا۔ اکثر مدرسین خارج شدہ کتابیں ہی پڑھاتے رہے۔

اصلاحِ نصاب کا ایک بڑا جزو انگریزی کی تعلیم تھا۔ یہ ۱۹۰۱ء میں شروع ہوئی تھی۔ پھر ۱۹۰۵ء میں سب طلبا کے لئے لازمی کردی گئی۔ ندوہ کی یہ خاص امتیازی شان سمجھی جاتی تھی لیکن اس کا جو حال رہا۔ وہ سید سلیمان کی زبان سے سنئے :۔

"۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپے ماہوار پر ایک انگریزی کا ماسٹر مقرر ہوگیا اور کچھ طالب علموں نے "اے بی سی ڈی" پڑھنی شروع کی مگر یہ تعلیم دفع الوقتی سے زیادہ نہ تھی۔ سالہا سال کے بعد بھی کوئی پرائمری سے آگے نہیں بڑھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب مولانا معتمد ہوئے تو ان کے اصرار سے صفر ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء کے ایک جلسہ میں ہر لڑکے کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور اس کی نگرانی کے لئے مولوی سید ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ مجلس دارالعلوم کے رکن منتخب ہوئے لیکن سرمایہ کی کمی کے سبب سے ماسٹروں کا بڑھانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے تعلیم کا نقص جاری رہا۔ ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ۵۰۰ روپیہ ماہوار کی امداد مدرسہ کی دنیاوی تعلیم کے لئے منظور کی تو انگریزی اسٹاف ضرورت کے مطابق مقرر ہوا اور انگریزی تعلیم باقاعدہ جاری ہوئی۔"

انگریزی کی تعلیم شروع کرنے کے علاوہ قدیم علوم میں بھی تبدیلی کی گئی اور اس پر بھی ندوہ کو بڑا ناز تھا لیکن غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اصولی اصلاح نہیں ہوئی۔ درسِ نظامیہ میں فلسفہ منطق اور نحو کی بھرمار تھی۔ مولانا نے یہ کیا کہ ان کی بعض کتابیں کم کرکے بعض نئے علوم داخل کر دیئے۔ فی نفسہ تو یہ ایک بڑی خدمت تھی لیکن نئے علوم داخل کرتے وقت نہ تو تفسیر و حدیث کو خاص

اہمیت دی گئی۔ جس سے ندوہ مذہبی حیثیت سے شاہ ولی اللہ کے طریقۂ تعلیم کی (جو دیوبند میں جاری تھا) خصوصیات اخذ کر لیتا اور نہ ہی کوئی خاص طور پر مفید نئے علوم بڑھائے گئے۔ انگریزی کا جو حال تھا۔ وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ قدیم مدارس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں تاریخ جغرافیہ جیسے ضروری علوم شامل نہیں۔ ندوہ میں بھی انھیں داخل نہ کیا گیا۔ ان مدارس کی ایک اور کمی یہ ہے کہ فارسی، جس میں اسلامی ہندوستان کا بیشتر علمی اور مذہبی ذخیرہ جمع ہے۔ اسے ان مدرسوں میں بار نہیں۔ ندوہ میں فارسی کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہ برتی گئی۔ بلکہ جو نئے علوم یعنی علم الکلام اور عربی ادب درس میں داخل کیے گئے۔ وہ دینی اور دنیاوی فائدے کے لحاظ سے ان ہی علوم کے ہم پایہ تھے۔ جن کی انھوں نے جگہ لی تھی!!

ندوہ میں جو نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ وہ ایک تعلیمی انقلاب کی حیثیت نہیں رکھتیں لیکن مولانا جیسے جید عالم اور انشا پرداز کا فیض دارالعلوم کے لئے ایک بڑی نعمت تھا۔ مولانا جتنے بڑے مصنف تھے۔ اتنے بڑے معلم نہ تھے۔ علی گڑھ میں بطور ایک پروفیسر کے وہ خاص طور پر کامیاب نہ تھے لیکن ان میں ایک بڑی خوبی تھی۔ وہ عام طلبا پر ضرورت سے زیادہ توجہ صرف نہ کرتے لیکن ہونہار اور منتخب طلبا پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ ندوہ کی مختصر دنیا میں اس وصف کی کارفرمائی کا خاص موقع تھا۔ چنانچہ شبلی چند ایسے برگزیدہ تلامذہ مثلاً سید سلیمان ندوی۔ مولوی عبدالسلام۔ مولوی مسعود علی ندوی کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اپنے رنگ میں رنگ سکے۔ جن کے قوم پر بڑے

علمی احسانات ہیں اور جو شبلی کے کام کو جاری رکھ سکے۔

اس کے علاوہ درس میں بھی بعض امتیازی باتیں تھیں۔ قدیم عربی مدارس میں اُس قدیم عربی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس میں قدیم مصنّفین اور ائمہ فن کی تصانیف ہیں۔ یہ زبان، جدید عربی سے، جس میں شام اور مصر کے اخبار لکھے جاتے ہیں۔ بالکل مختلف ہے۔ ندوہ میں جدید عربی پر زیادہ توجہ دی گئی۔ فی نفسہٖ یہ بھی ایک اتنی بڑی خوبی نہیں۔ جتنا اسے ندوہ یا بعض انگریزی کالجوں میں خیال کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں کوئی نہیں کہتا کہ انگریزی طریقۂ تعلیم میں لاطینی کی جگہ جدید اطالین کو دے دی جائے۔ اور فارسی کے جو اساتذہ سمجھتے ہیں کہ سعدی اور رومی کی غیر فانی تصنیفات سے واقف ہونے کے بجائے پور داؤد اور رحمان زادہ کے خیالات سے واقف ہونا زیادہ ضروری ہے۔ وہ شاید سعدی اور رومی سے انصاف نہیں کرتے۔ لیکن بہر کیف، روزمرّہ کی بعض ضروریات، جدید اسلامی دنیا سے تعلقات قائم کرنے اور اسلامی ممالک کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جدید عربی مفید ہے اور ندوہ کا یہ ایک خوشگوار امتیاز ہے کہ وہ جدید عربی پر بھی توجہ ہوئی اور یہ کوشش کی گئی کہ طلبا جدید عربی سیکھ کر مصر و شام کے عربی رسائل پڑھ سکیں۔

مولانا شبلی کے تعلق کی وجہ سے ندوہ کے طریقۂ تعلیم میں بعض خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں لیکن دارالعلوم پر ان کے جتنے احسانات بطور ایک مشہور اہلِ قلم کے تھے۔ بطور ایک معلم کے نہ تھے۔ ندوہ کیلئے ایک بڑا کام انھوں نے یہ کیا کہ یہاں ایک نہایت گراں قیمت کتب خانہ جمع کر دیا۔ وہ ایک مشہور مصنّف تھے جانتے تھے کہ اچھی کتابیں کہاں کہاں جمع ہیں اپنا بیش قیمت ذخیرہ کتب ندوہ کو

بخش دیا اور اپنے اثر اور رسوخ سے کتب کے بعض بڑے قیمتی ذخیرے ندوہ میں کھینچ لئے۔ جن میں بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں مرحوم۔ دہلی کے نواب ضیاء الدین احمد خاں دہلوی مرحوم اور حیدر آباد کے نواب عماد الملک بلگرامی کے مجموعے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

لیکن شبلی نے ندوہ کی سب سے زیادہ خدمت اپنے قلم سے کی قومی بہی خواہی کے تقاضے اور شبلی کی انانیت انھیں مختلف میدانوں میں لے گئی۔ اُنھوں نے سیاسیات میں بھی ہاتھ مارا۔ ایک دار العلوم بھی چلانا چاہا۔ نصابِ تعلیم میں بھی نئی راہیں نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ سب سے پہلے اور سب سے آخر ایک اہل قلم تھے اور اپنے قلم سے ندوہ اور قوم کی خدمت کرنے کا انھیں موقع الندوہ کے ذریعے ملا۔ جس کے وہ ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک ایڈیٹر رہے اور جس میں ان کے اور کئی دوسروں کے بیش قیمت علمی اور ادبی مضمون شائع ہوئے۔ سید سلیمان ندوی اس رسالے کی نسبت لکھتے ہیں :-

" اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علماء کی سطحِ جامد میں حرکت پیدا کی تھی۔ اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق۔ عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے۔ جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا۔ پھر بھی جو آتا تھا۔ وہ ان ہی کو دُہرا دُہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا۔ منطق اور فلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا۔ حاشیے لکھنا۔ غیر مفید مناظرانہ رسائل تالیف کرنا۔ یہ علماء کے مشاغل تھے۔ حالانکہ زمانہ کا رُخ

اِدھر سے اُدھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علومِ اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضرورتیں پیدا کر دئے تھے۔ الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا........

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا۔ اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے۔ زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے اور جو اس کو پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی اس کو پڑھ کر اس کے مطابق، لکھنے کی کوشش کرنے لگے"

الندوہ سے پہلے بھی ملک میں ایسے رسالے جاری ہو چکے تھے جن میں بلند پایہ علمی و ادبی مضامین چھپتے تھے۔ علی گڑھ کا مرحوم معارف ان میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ لاہور کا مخزن بھی الندوہ سے بہت پہلے شروع ہوا تھا۔ لیکن یہ رسالے نئے لوگوں کے تھے اور انھیں قدیم اسلامی مدارس اور علما کے حلقوں میں بار نہ تھا۔ الندوہ ایک اسلامی مدرسے کا ترجمان تھا۔ طبقۂ علما پر اس کا زیادہ اثر ہونا ناگزیر تھا۔ اور اس کی توڑ پر جو رسالے نکلے (مثلاً دیوبند کا القاسم) ان سے بھی قدیم اسلامی مدارس کو فائدہ پہنچا۔

قوم کی عام علمی خدمت کے علاوہ الندوہ نے ندوہ کے ہونہار طلبا کو موقع دیا کہ وہ تحریر و تصنیف کی ابتدائی منزلیں، ایک کہنہ مشق اور کامل الفن اُستاد کی نگرانی میں، دارالعلوم کے قیام میں ہی طے

کرلیں۔ سید سلیمان ندوی۔ مولوی عبدالسلام اور ندوہ کے کئی دوسرے مشہور اہلِ قلم حضرات کی بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی تھی۔ اور وہ مضامین، جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ادبی حیثیت سے نہیں، بلکہ علمی اور مذہبی حیثیت سے پہلے پہل ملک کے سامنے پیش کیا۔ الندوہ میں ہی شائع ہوئے تھے۔ جس کے وہ ایک سال تک سب ایڈیٹر رہے۔

قوم کی علمی خدمت اور ہونہار طلبا کی تصنیفی تربیت کے علاوہ شبلی نے الندوہ کے ذریعے ندوہ کی آواز کو وہاں تک پہنچایا۔ جہاں اور کسی طرح اس کی رسائی نہ تھی۔ خالص تعلیمی حیثیت سے ندوہ ایک نہایت مختصر سا مدرسہ تھا۔ ۱۹۰۸ء تک اس کی مستقل آمدنی پونے دو سو روپے ماہوار سے زائد نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں کتنا بڑا ادارہ چل سکتا تھا۔ دیوبند اور دوسرے قدیم اسلامی مدارس کے سامنے اس کی کوئی ہستی نہ تھی۔ لیکن جس وقت ندوہ کی شہرت کا ڈنکا ہر طرف بج رہا تھا۔ قوم کے با اثر حلقوں میں ان دارالعلوموں سے، جن کے ایک درجے میں ندوۃ العلما کے سارے مدرسے سے زیادہ طلبا زیرِ تعلیم تھے۔ ایک عام بے خبری تھی۔ اس کی ایک وجہ تو مولانا شبلی جیسی مشہور ہستی کا ندوہ سے انتساب تھا اور دوسرا سبب الندوہ تھا۔ جس کی وجہ سے قوم اربابِ ندوہ کے ارادوں، تجویزوں اور کارناموں سے پوری طرح باخبر تھی۔

مولانا کی توجہ اس وقت تمام تر ندوہ پر لگی ہوئی تھی لیکن وہ اپنی تصنیف و تالیف کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ E

رکھوں کچھ اپنی بھی میں چشم خوں فشاں کیلئے

موازنہ انیس و دبیر ندوہ میں آکر ختم ہوا اور شعر العجم کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ موخر الذکر تالیف کے لئے مولانا نے ندوہ سے تین ماہ کی رخصت لی اور بنارس میں جاکر قیام کیا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ اپنے کالج کے شاگرد، مولانا محمد علی سے ملنے بڑودہ گئے اور یہ سفر اس لئے قابل یاد بن گیا کہ یہاں مولانا محمد علی کے ایما پر، انھیں مارگولیتھ کی کتاب کے جواب میں سیرۃ النبی اور عام اعتراضات کے جواب میں مضامین عالمگیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ وہ اعظم گڑھ اکثر آتے جاتے تھے اور ۱۹۰۷ء میں اعظم گڑھ میں وہ حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں ایک پاؤں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کا تفصیلی بیان مولانا کی اپنی زبان سے سنئے:۔

ایک اتفاقی تقریب سے میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں آیا تھا اور ارادہ تھا کہ دو مہینے یہاں قیام کروں گا۔ شعر العجم کے اجزاء زیر تحریر تھے۔ اور شاہنامہ پر ریویو کر رہا تھا۔ سترھویں مئی ۱۹۰۷ء قریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرہ میں گیا۔ اندر تخت بچھے ہوئے تھے۔ میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ میں اٹھالی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دے دی۔ اتفاق سے گھوڑا گر گیا۔ بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی۔ بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ کارتوس میں اگرچہ چھرّے تھے لیکن چونکہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا۔ اس لئے ٹخنہ کی ہڈی چور ہو گئی اور پاؤں کٹ کر صرف

دو تسمے لگے رہ گئے۔

جس وقت ضرب لگی۔ مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی اور اس وقت میں نے گھبرا کر کہا کہ یہ کیا ہوا؟ آواز سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آ گئے۔ اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اور پاؤں جوتے میں تھے۔ ایک عزیز نے آ کر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں نے جوتے میں سے نکال لیا۔ اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے پاؤں اوپر اُٹھا دیا اور نوکروں سے کہا کہ اس پر پانی ڈالو۔ پانی جب ڈالا جاتا تھا تو پاؤں میں بھک بھک دُھواں نکلتا تھا۔ قریباً پاؤ گھنٹہ تک میں پاؤں اُٹھائے بیٹھا رہا۔ جب پنڈلیاں دُکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب تکیہ لا کر میرا پاؤں اس پر رکھ دو۔ آدمی نے رو کر کہا۔ کیا چیز ہے۔ جو رکھی جائے مجھ کو اس وقت معلوم نہ تھا کہ میری ایڑی جُدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتدا میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی اور جو کچھ میں نے پاؤں کے متعلق حالات بیان کئے ہیں۔ وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں۔

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا۔ نوکر اور ماما وغیرہ تھیں۔ یہ لوگ سخت زار و قطار روتے تھے اور میں ان کو منع کرتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹہ کے بعد فرزند عزیز محمد حامد آیا اور زخم کو دیکھتے ہی چیخ اُٹھا اور بہت بے قراری کے ساتھ گریہ و زاری کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔ میں نے نوکروں سے کہا کہ اس کے مُنہ پر پانی چھڑکو اور حلق میں پانی ٹپکاؤ۔ اس سے اس کو

ہوش آگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیز بھائی جنید۔ سول سرجن اور اسسٹنٹ سرجن کو ساتھ لے کر آئے۔ بڑی غلطی یہ ہوئی کہ جو رگیں کٹ گئی تھیں۔ ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا اور خود مجھ کو اور نہ نوکروں چاکروں میں سے کسی کو خیال آیا کہ اس پر پٹی کس کر باندھ دیں۔ جس سے خون رُک جائے۔ بہر حال ڈاکٹر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رگوں کے منہ باندھ دئے جس سے خون رُک گیا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پاؤں جوڑنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالئے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ پاؤں کاٹنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ غرض بے ہوشی کی دوا پلائی گئی اور عملِ جراحی شروع کیا گیا۔ چونکہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں۔ اس لئے نصف پنڈلی جدا کردی گئی اور ہر زہ گردی کی سزا دی گئی۔ عملِ جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا۔ اور زخموں کے ٹانکے اور رگوں کی کھچاوٹ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ آج نواں دن ہے۔ ڈاکٹر ایک دن بیچ میں دے کر زخم کھولتا ہے۔ دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے۔ تکلیف میں ابھی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی عمر پائی۔ بہت چلا پھرا۔ دوڑا۔ دھوپا۔ ملا۔ جُلا۔ آخر

کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہئے تھا۔ نہ بیٹھا تو قسمت نے بٹھا دیا۔ ع

"گر نستانی بہ ستم می رسد"

مولانا کی شدید قوتِ احساس اور کمزور طاقتِ برداشت کا سب نے اعتراف کیا ہے۔ وہ ذراسی بات پر خلاف طبع ہونے پر تلملا اٹھتے تھے۔ اسی خاصیت کا نتیجہ تھا کہ وہ علی گڑھ۔ حیدر آباد۔ ندوہ۔ جہاں بھی رہے۔ بہت خوش نہیں رہے اور جم کر قیام نہ کر سکے۔ اس شاعرانہ شدتِ احساس نے ان کے لئے زندگی دو بھر کر رکھی تھی اور ان کے رفقا کو بھی سخت مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ یہ ایک قابلِ ذکر بات ہے کہ دورِ حاضر کی کسی مشہور شخصیت کے طور طریقوں سے اتنے لوگ نالاں نہیں۔ جتنے قوم کے نہایت برگزیدہ اور مخلص انسان شبلی سے تھے۔ شبلی کے شدتِ احساس کو ان کے معتقد بھی مانتے ہیں۔ سید سلیمان ان کے "زود اشتعال جذبات" کا ذکر کرتے ہیں اور مولانا حبیب الرحمن شروانی نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جس میں ان کے روبرو ایک نیم مردہ بھڑ کے کاٹنے سے مولانا تلملا اٹھے تھے اور آنکھوں میں آنسو آئے تھے!

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا میں ایک خوبی تھی وہ اعصابی کمزوری کی بنا پر ذراسی بات پر تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ لیکن جب اُن کے سر پہ آرے چلتے تو ان کے ماتھے پر شکن بھی نہ آتی۔ سید شبلی ماں کی آمد اور والد کی تقسیم جائداد سے تو وہ اتنے جز بز ہوئے کہ شریعت کے احکام اور والدین کی اطاعت کے اُصولوں کو بھی بھول گئے لیکن

جب والد کی وفات ہوئی اور سوتیلی ماں سے اختلافات کا اصل زمانہ آیا تو انھوں نے وہ سعادت مندی اور برخورداری دکھائی کہ سوتیلی ماں بھی آفریں کہتی ہوگی۔ اسی طرح ایک نیم مردہ بھڑ تے تو انھیں بے حال کر دیا۔ لیکن جب انھیں ایک حقیقی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ان کا پاؤں کٹا اور ان کے جسم کا ایک حصّہ ان سے علحدہ ہوگیا...

.....تو انھیں خبر تک نہ ہوئی!!

پاؤں کے حادثے نے مولانا کو سخت جسمانی اذیت میں مبتلا کیا۔ لیکن یہ ان کی ہمت اور استقلال کا امتحان تھا۔ وہ معمولی واقعات میں ضبط اور حوصلے کی ضرورت نہ سمجھیں لیکن کٹھن امتحانوں میں ناکام ہونا ان کی خودداری کو گوارا نہ تھا۔ وہ تین مہینے تک بسترِ علالت پر رہے لیکن شکایت کا ایک حرف ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ واقعہ کے کوئی تین ہفتے بعد مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

> زخم کی حالت دس روز تک اچھی تھی لیکن بعد کو ریم آنے لگی اور اب تک آتی ہے۔ اسسٹنٹ روزانہ آتا ہے اور دن میں دو بار زخم دھویا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک تکلیف میں کوئی کمی نہیں۔ تکلیف گو سخت ہے لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے۔ جنھوں نے سر کٹوائے تھے۔ پاؤں کٹنے پر کیا روؤں۔ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ۔

مولانا کو پوری صحت ہوتے دیر لگی تو نواب محسن الملک نے علی گڑھ سے لکھا کہ آپ یہاں آجائیں۔ یہاں کے بہترین ڈاکٹر آپ کا علاج بلامعاوضہ کریں گے لیکن مولانا علی گڑھ نہیں جاسکے۔ بمبئی گئے اور وہاں لکڑی کا ایک مصنوعی پاؤں بنوایا۔

پاؤں کٹ جانے سے مولانا کے قومی کاموں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ بلکہ ایک مصنوعی پاؤں سے ان کی دشت پیمائی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور مزاج میں ایک بالکل نئی وارستگی اور آزادی آگئی۔ وہ اب تک شدتِ جذبات کے باوجود سخت محتاط اور مصلحت شناس رہے تھے۔ لیکن حادثۂ پا کے بعد ان کے خیالات اور عمل میں ایک نئی بے باکی اور بے جگری سی نظر آتی ہے۔ جس کا اثر نہ صرف اسلامی ہندوستان کی ادبی تاریخ پر، بلکہ قوم کی سیاسی رفتار پر بھی پڑا۔

ندوہ کے لئے بھی شبلی کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ اس سے پہلے انھوں نے ۱۹۰۵ء میں ندوہ کے لئے بھوپال سے پچاس روپے ماہوار کی امداد حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ ندوہ کے غریب طلبا کے لئے بہاولپور سے پچیس روپے اور حیدرآباد سے پچاس روپے ماہوار آتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد سے پچاس روپے ماہوار مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ کے لئے مقرر ہوئے تھے لیکن انھوں نے بہ کمال ایثار یہ رقم ندوہ کے نام منتقل کر دی۔ ندوہ ان ہی عطیوں کے ذریعے چلتا تھا لیکن پونے دو سو روپے ماہوار سے ایک دار العلوم نہیں چل سکتا۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں کو جب اسلامی ریاستوں اور مسلمانوں سے کوئی خاص مدد نہ ملی تو انھوں نے انگریزی حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ندوہ ایک زمانے میں سیاسی حیثیت سے گورنمنٹ کی نظروں میں مشتبہ ہو گیا تھا۔ منشی محمد اطہر علی۔ نواب محسن الملک اور جسٹس شرف الدین نے ان شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی اور جو شبہے باقی رہ گئے تھے

انھیں ۱۹۰۶ء میں پٹیالہ کے فارن منسٹر کرنیل عبدالمجید خاں نے حکام سے مل کر دور کر دیا۔ اسی دوران میں مولانا نے الندوہ کی ایک اشاعت میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی وفاداری، سیاسی حیثیت سے ہی نہیں، بلکہ مذہبی احکام کی رو سے بھی فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریری مضمون کا بھی حکومت کو مطمئن کرنے میں بڑا دخل ہو گا۔[1]

اسی اثنا میں ندوہ کے معاون اور شبلی کے دوست، منشی مشیر حسین قدوائی نے ایک انگریزی اخبار میں ایک مضمون لکھ کر محکمہ تعلیمات سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ندوہ کو امداد دے۔ اس مضمون کے جواب میں محکمہ تعلیمات کے افسر نے منشی صاحب کو لکھا۔ اگر ندوہ کو مدد کی ضرورت ہے تو وہ گورنمنٹ کے پاس درخواست بھیج سکتا ہے۔ چنانچہ ندوہ سے "مالی اور اعزازی" امداد کی درخواست بھیجی گئی اور طرفین کی خط و کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے ندوہ کو پانچ سو روپے ماہوار کی امداد اس شرط پر دینی قبول کی کہ یہ رقم، مدرسہ کی غیر مذہبی تعلیم یعنی انگریزی۔ ریاضی۔ عربی ادب وغیرہ پر

---

[1] سید سلیمان ندوی حیاتِ شبلی (ص ۴۳۱) میں لکھتے ہیں کہ "یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ کو اس کے اس پانچ ہزار سالانہ امداد کی قیمت ادا کی جو اس نے دارالعلوم کو دینا منظور کی تھی۔" لیکن یہ مضمون ستمبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا اور گرانٹ ۱۰ ار نومبر ۱۹۰۸ء کو جاری ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون ایک احسان کا معاوضہ نہ تھا بلکہ اگر مضمون اور سرکاری گرانٹ میں کوئی تعلق ہے تو زرِ امدادی کو اس وفادارانہ فتویٰ کا انعام سمجھنا چاہئے۔

سید سلیمان یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا نے ردِ مختار کے جس فقرے پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کا ترجمہ انھوں نے بالکل غلط کیا ہے۔

خرچ ہو۔

ندوہ کا مدرسہ ابھی تک لکھنؤ کے اندر ایک پرانی قسم کے مکان میں تھا۔ اور منتظمین کا خیال تھا کہ ندوہ کے مکان کی بدحیثیتی اس کو اُبھرنے نہیں دیتی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر خاص توجہ شروع کی اور اپریل ۱۹۰۷ء میں کارکنان ندوہ کی طرف سے ایک اپیل شائع ہوئی۔ جس میں مدرسہ کیلئے نئی عمارت کا تخمینہ پچاس ہزار روپیہ کیا گیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر پچاس حضرات ایک ایک ہزار کے چندے دیں تو یہ نیک کام بآسانی تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کٹھن کام کو ندوہ کے باہمت سفیر مولوی غلام محمد شملوی نے بہت جلد پورا کردیا۔ وہ ندوہ کی اپیل لیکر بہاول پور پہنچے۔ جہاں نواب صاحب کی والدہ ماجدہ نے کہا کہ اس رقم کے لئے پچاس اشخاص کو تکلیف دینے کی کی ضرورت نہیں۔ ساری رقم میرے بچ کے خزانے سے لے لی جائے!!

روپے کا انتظام ہوا تو تعمیرِ عمارت کیلئے زمین کی فکر ہوئی۔ اس مشکل کو لکھنؤ کے حکام نے حل کردیا۔ انھوں نے دریائے گومتی کے کنارے ایک وسیع اور خوش منظر قطعۂ زمین، جہاں ندوہ کی موجودہ عمارت ہے، بالکل برائے نام قیمت پر ندوہ کو دے دیا اور عمارت کیلئے جلسۂ سنگ بنیادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ندوہ کو ان دونوں حکومت سے روابط بڑھانے کا خاص خیال تھا اور کچھ احسانات کا بوجھ ہلکا کرنے کا بھی احساس ہوگا۔ چنانچہ سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر صاحب کو دعوت دی گئی۔

کسی دوسرے مذہبی ادارے کا سنگِ بنیاد کسی غیر مسلم یا سرکاری حاکم کے ہاتھوں رکھا جاتا تو پتہ نہیں مولانا شبلی کیسے کیسے فقرے کستے لیکن اب اپنا معاملہ تھا جلسے کی روداد پڑھئے اور دیکھئے کہ شبلی خوشی سے کس طرح

سے باہر ہو رہے تھے۔ فرماتے ہیں :۔

"یہ پہلا موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء بیانی فرمانروا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سُنّی ایک مذہبی درسگاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درسگاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا) غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مذہبی سقف کے نیچے نصرانی۔ مسلمان شیعہ۔ سُنّی حنفی۔ وہابی۔ رند۔ زاہد۔ واعظ۔ خرقہ پوش اور کجکلاہ سب جمع تھے۔ ع

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں"

جلسۂ سنگِ بنیاد کے بعد ندوہ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں مولانا نے ایک فارسی ترکیب بند پڑھا۔ اگر اس نظم کا اس ترکیب بند سے موازنہ کریں۔ جو اس سے چھ سال پہلے شبلی نے امرتسر کے اجلاس میں پڑھا تھا تو اس لطیف بلکہ عمیق فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو شاعر کے نقطۂ نظر میں اس دوران میں پیدا ہو گیا تھا۔

پہلے ترکیب بند میں، جسے ہم نے ندوہ کا منشورِ انتخابی کہا تھا، اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ ندوہ دین اور دنیا قدیم دور جدید کا سنگم ہو گا۔ لیکن اب ندوہ کو بالصراحت، جدید کے مقابلے میں قدیم کا اور دنیا کے مقابلے میں دین کا ترجمان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جلسۂ سنگِ بنیاد نہ اسے اجلاس کی کامیابی میں ایک باہمت، دنیادار خاندان کے عطیے کو بڑا دخل تھا لیکن اس اجلاس کے ترکیب بند میں دنیاداروں پر ایک لطیف مگر مسلسل طنز ہے۔ پہلے بند میں دنیاداروں کا بیان

ہے ؎

اے کہ نیرنگِ سراپردۂ عالم دیدی
جاہِ کیخسرو و فرِ حشمِ جم دیدی

داستانہائے جہانگیریِ خسرو خواندی
زورِ بازوئے کمند افگنِ رستم دیدی

نا بہانگیریِ شمشیر و سناں بشنیدی
ہم طرازندگیِ خامہ و خاتم دیدی

الغرض ہر چہ جہاں را ز سراماں باشد
ہمہ را دیدی و خود گیر کہ پیہم دیدی

لیک بالاتر ازیں جملہ جہانے دگر است
کہ درو کالبدے دیگر و جانے دگر است

پھر اُس دنیا کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس کی نمائندگی کا ادّعا ندوہ کو تھا ؎

سخن آنجا رود از منبر و محراب دعا
گر حدیثے ہمہ از گنبد و ایواں باشد

تو حدیث از جم و کیخسرو و دارا گوئی
سخن آنجا ز مسیح و نہ سلیماں باشد

داستانہائے تو افسانۂ شاہست و وزیر
حرف آں بزم ز پیغمبر و یزداں باشد

تو بہ فرمودۂ اسپنسر و بیکن نازی
سخن آنجا ہمہ از گفتۂ یزداں باشد

کم ز آئینِ جہانداریِ سو لن بنود
آں اساسے کہ برآوردۂ نعماں باشد

اسی طرح جدید اور قدیم کا موازنہ ہے۔ امرتسر والے ترکیب بند میں شبلی نے جدید اور قدیم دونوں پر طعنہ زنی کی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے اُستاد مولانا محمد فاروق چریاکوٹی نے اس کے جواب میں اور قدیم کی حمایت میں بعض اشعار لکھے تھے لیکن اب ان کا نقطۂ نظر وہی تھا جو اس سے چھ سال پہلے ان کے اُستاد کا تھا اور اب قدیم کے مقابلے میں جدید پر مسلسل طنز ہے ؎

شرطِ اسلام نباشد کہ بجز دنیا طلبی
التفاتِ تو بہ دینِ نبوی کم باشد

روز بازار بود فلسفہ و ہندسہ را
نامۂ شرح پراگندہ و درہم باشد

رسم اسلام نباشد کہ بہ تحصیلِ علوم — ہیئت و ہندسہ بر شرع مقدم باشد
نکتہ و شرع بہ افسانہ برابر نہی — یورپ [illegible] آں نیز مسلم باشد
حلِ ہر مسئلۂ فقہ ز یورپ طلبی — شرع پیش تو ز تقویم کہن کم باشد
از ابوبکر و عمر ہیچ بہ یادت ناید — گرمیٔ بزمِ تو از سپنسر و اعظم باشد
در سخن بگذر د از سیرت و شانِ نبوی — ہر چہ گوئی ہمہ از گفتۂ ولیم باشد

شاید یہ اشعار پڑھ کر بعض لوگ پوچھیں کہ نئی نسل میں وہ کون سے لوگ ہیں۔ جو اسپنسر اور ہیکن پر ناز کرتے ہیں۔ یا آئین جہانداری سولن کو فقۂ نعمانی پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ اس آئین سے صحیح طور پر آشنا بھی ہیں؟ اسی طرح یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے مسلمان، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ کو یاد نہیں کرتے اور جن کی سرگرمیٔ محفل سپنسر و اعظم یا "گفتۂ ولیم" (؟) سے ہوتی ہے کہیں صفحۂ ہستی پر موجود بھی ہیں۔ یا ان کا وجود فقط شاعر کے تخیل میں ہے؟ یہ سوالات بیجا نہیں اور شبلی نے جو کچھ بالصراحت بالا لایا کہا ہے اسے ہو بہو اور ہر حیثیت سے واقعات کے مطابق ثابت کرنا کسی قدر مشکل ہے لیکن شبلی ایک وکس اور مناظر پہلے تھے مصنف بعد میں ہوئے الفاظ ان کے لئے فقط اظہارِ حقیقت کا ذریعہ نہ تھے۔ بلکہ خیالات کو بدلنے اور "آدمیوں کے دل پر حکومت[1]" کرنے کا آلۂ کار۔ انھیں ندوہ کی کی ضرورت اور اہمیت واضح کرنی تھی اور اگر اس نیک مقصد کے لئے مستثنیات کو کلیات بنا کر پیش کر دیا جائے تو اس میں کون سی بڑی قباحت

---

[1] مکاتیب شبلی جلد اوّل ص ۲۴۸

جلسہ سنگِ بنیاد بخیر و خوبی ختم ہوا لیکن افسوس کہ نئی عمارت مولانا کی اُمیدوں کا مرکز نہیں، بلکہ مدفن ثابت ہوئی۔ انھیں آئیں درس دینا نصیب نہ ہوا۔ بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے، ان کے حریف، ان کے ندوہ سے نکل جانے کے بعد پہلی مرتبہ یہاں آئے۔

اس کے علاوہ یہ عمارت بھی مکمل نہ ہو سکی۔ جب نواب صاحب بہاولپور کی والدہ ماجدہ نے پچاس ہزار دیئے تھے تو اس وقت توقع تھی کہ اگر خرچ تخمینے سے زیادہ ہوا تو مزید رقم بھی ملے گی لیکن اس اثنا میں (دیوبند کے ؟) علما بہاولپور جا پہنچے۔ انھوں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ "ندوۃ العلما کے دار العلوم میں (نعوذ باللہ) الحاد و لامذہبی کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں روپیہ دینا معصیت ہے۔"

اس خبر سے مضطرب ہو کر بیگم صاحبہ نے مولوی سر رحیم بخش مرحوم پریزیڈنٹ کونسل ریاست کو (جن کی تحریک سے رقم بالا ملی تھی) بلا کر کہا "سائیں جی روپیہ کس کو دلوا دیا۔" ایک مولوی صاحب نے رفعِ الزام کی کوشش کی۔ تاہم شوقِ امداد سرد ہو گیا۔ مزید رقم نہ مل سکی اور عمارت آج تک ناتمام ہے۔[1]

جس زمانے میں جلسۂ سنگ بنیاد کے انتظامات کے لئے مولانا کو لکھنؤ آنا پڑا۔ وہ بمبئی کے چمن زار میں مصروفِ گل چینی تھے۔ اس حالت میں انھیں بمبئی چھوڑنا سخت ناگوار تھا۔ کئی خطوں میں اس کی شکایت کی ہے۔ ایک خط میں نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں:۔

---

[1] حیاتِ شبلی صفحہ ۴۸۰

عین اس وقت کہ چمن زارِ بمبئی کی گلگشت نے عالمِ طلسم میں پہنچا دیا تھا بہاولپور کے عہدہ داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آنے ہیں اور اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل اُسی حالت میں بمبئی سے نکلا جسطرح مرحوم شدّاد نے بہشتِ عدن کو خیرباد کہا تھا۔

ایک اور خط میں ہے:۔

اب کے بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں۔ لیکن عین عالمِ لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا۔ لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔

مولانا دل پر پتھر رکھ کے اور اپنی ذاتی دلچسپیوں پر قومی فرائض کو ترجیح دے کر بمبئی سے لکھنؤ آگئے۔ لیکن یہ دلچسپیاں بھی ان کی زندگی کا ایک ضروری، بلکہ عزیز جزو تھیں۔ شبلی کے دوسرے سوانح نگاروں کی طرح ان سے چشم پوشی کر کے صحیح شبلی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آئندہ باب میں ہم کسی قدر تفصیل سے ان کا ذکر کریں گے۔

وادیٔ گل

زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی
ورنہ عمرے ہر دو را باہم نفاق افتادہ بود (شبلی)

شبلی کے مشاغلِ شباب کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے لکھا کہ وہ بہ یک وقت مذہب حنفیہ کے ایک متشدّد پرستار اور اعظم گڑھ کے رئیس المتغزلین تھے۔ وہ اس زمانے میں تارکینِ صلوٰۃ کو نماز نہ پڑھنے پر دو دو گھنٹے تک پیٹا کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ، شہر میں جو مشاعرے ہوتے تھے۔ ان کے میر مجلس بنتے اور گرم گرم عاشقانہ اشعار لکھتے۔ وہ علی گڑھ گئے تو ان کی فطرت کی یہ ثنویت کسی قدر دب گئی لیکن ایک فطری شاعر کی طبیعت کو قومی مصلحت کی زنجیریں کب تک جکڑ سکتی ہیں۔ انھیں اس فضا سے ذرا بھی نکلنے کا موقع ملتا تو پرانے مشاغل پھر تازہ ہو جاتے۔ انھوں نے روم و مصر و شام کے سفر پر جو نظم لکھی ہے۔ اس میں شبلی کی بوقلمونی طبیعت کا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

گاہ در بزمِ فقیہانِ گراں مایہ رسید — گاہ در حلقۂ رندانِ نظر باز آمد
گاہ با سادہ دلاں شیوۂ تقلید گرفت — گاہ با دیدہ وراں پردہ در راز آمد
گاہ در بیتِ مقدس بہ بر مفتیٔ شہر — از رخ شاہدِ فن پردہ بر انداز آمد
گاہ در قاہرہ پنہانی تقاضائے ہوس — بہ تفنگیز شد و در جلوہ گہ ناز آمد

وہ حیدر آباد گئے تو یہ زنجیریں اور ڈھیلی ہو گئیں اب وہ داغ وغیرہ کی صحبت میں غزل سرائی کرتے۔ گاہے گاہے بمبئی بھی جاتے لیکن اس زمانے کے مشاغلِ رنگیں کسی صراحت سے صفحۂ قرطاس پر ثبت نہیں ہوئے۔ اس لئے ان کی نسبت جو کچھ لکھا جائے گا۔ وہ قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔ بعض خطوط میں مبہم اشارات ہیں۔ جو خدا معلوم کس بات کی نسبت ہیں۔ ایک خط میں نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو، جو ان کے محرم راز دوست تھے لکھتے ہیں :-

مدراس ضرور تشریف لایئے۔ مجاز قنطرۃ الحقیقت ہے۔

اس کے کوئی تین چار ہفتے بعد، جب مولانا شروانی مدراس ہو کر واپس گئے۔ اور وہاں سے شاید ان مشاغلِ مدراس کی نسبت کچھ لکھا تو شبلی جواب میں کہتے ہیں :-

میں نے مدراس میں نئی وادی میں قدم نہیں رکھا بلکہ یہ پرانا کوچہ تھا جس کی مدتوں خاک چھانی۔ ع ما ہم از مستانِ ایں مے بودہ ایم۔ زمانہ کے ہاتھوں دوسروں کے لئے اپنی جگہ خالی کرنی پڑی تھی ؎

از ہماں بزم کہ جز من گرے راہ نداشت ... بایدم رفت کہ بہرِ دگراں جا باشد

اس کے بعد مولانا ندوۃ العلوم لکھنؤ میں چلے گئے، اور ایک مذہبی درسگاہ کے صدر نشین ہوئے۔ بظاہر تو اس تعلق کو اُن کی رومانی زندگی کا خاتمہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن انسانی فطرت ایک بڑی پیچیدہ اور رجا مد چیز ہے۔ شبلی نے اپنے آپ کو ندوہ سے بعض قومی اور ذاتی مصلحتوں کی بنا پر وابستہ کیا تھا۔ وہ وہاں سے کسی ایسے فوری، شدید اثر و جذبے کے تحت نہیں گئے تھے۔ جو انسانی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ جو آگ ان کے دل کے اندر اعظم گڑھ اور حیدر آباد میں سلگ رہی تھی۔ وہ اب بھی

نہ بجھی تھی۔ ان کی طبیعت کی ثنویت برابر قائم تھی بلکہ جب افراط سے ان کی زندگی کا مذہبی پہلو زیادہ نمایاں ہوا۔ اسی شدت سے ان کی اندرونی آگ اور بھڑک اٹھی۔ لیکن اس مردِ باتدبیر نے، جو بہ یک وقت مختلف معبودوں کی پرستش میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ ان مخالف جذبات کی تسکین کا سامان کرلیا اور وہ بھی اس خوش اسلوبی سے کہ ان میں کوئی کشمکش پیدا نہ ہوئی۔ انھوں نے لکھنؤ سے بہت دور ایک آستانہ ڈھونڈھ لیا۔ جہاں ایک حسن پرست شاعر کے دل کی ساری حسرتیں پوری ہوتیں۔ لیکن جب وہ لکھنؤ پہنچتے۔ تو پھر جبّہ و عمامہ پہن کر مجلسِ علما میں صدر پر جا بیٹھتے۔ اور زبانِ حال، بلکہ زبانِ قال سے کہہ اٹھتے ؎

شاعری از من مجو دور از سوادِ بمبئی
حالیا شبلیؔ شدم، رندِ غزل خواں نیستم

اور ؎

زبمبئی چوں بہ ہندوستاں رسم شبلیؔ　　زیادہ بگزرم و باز پارسا گردم

شبلیؔ کی رومانوی زندگی کا پہلا رنگیں مرقع دستۂ گل ہے جس کی غزلیں ستمبر ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کے شانِ نزول کی نسبت مہدی حسن کو ۱۱ ستمبر کے ایک خط میں بمبئی سے لکھتے ہیں :۔

"۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرّک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کرسکتا۔ اپالو یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہے۔ اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے۔

کنارِ آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

اس غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخِ بے پروا   گذشتن از سر رہ مشکل اُفتاد است ہر پا را

تین چار غزلیں لکھیں جو کبھی آپ کی نظر سے گذریں گی۔"

دستۂ گل صحیح معنوں میں ایک پھولوں کا گلدستہ ہے اور پھول بھی ایسے، جن کی شادابی اور خوبیٔ رنگ و بو کا ہندوستان کی فارسی شاعری میں جواب نہیں۔ یہ غزلیں، الفاظ کے انتخاب، خیالات کی تازگی اور طرزِ ادا کی شستگی میں تراشے ہوئے ہیرے ہیں۔ لیکن جذبات کی شدت دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست طوفانی دریا، جو مدتوں اینٹ پتھر کے ایک بند سے ٹکراتا رہا۔ اب بند توڑ چکا ہے اور پورے زور شور سے بہہ رہا ہے۔ پہلی غزل ہے ؎

چند بیہودہ بہ بندِ غمِ دنیا باشم   زیں سپس با قدح و بادہ و مینا باشم
جُبّہ سائے حرم کعبہ چو بودم یک چند   بر درِ بتکدہ ہم ناصیہ فرسا باشم
گرچہ رندی و ہوس شیوۂ دانا نبود   حاجتم نیست کہ فرزانہ و دانا باشم
بادہ ہر چند تہِ خرقہ تواں نیز کشید   نرگسِ مست کسے خواست کہ رُسوا باشم!

ایک اور غزل میں اسی کیف و سرمستی کا اظہار ہے ؎

اندکے نیز بہ کامِ دلِ خود بیں باشم   روزگارے چو دم از دانش و عرفاں زدہ ام
چند در پردہ تواں کرد سخن، فاش بگوئے   سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام۔ ہاں زدہ ام
داستاں گر دم ازیں بیش کہ با پیرِ ہدیٰ در رع   با بتاں جامِ طرب یا نئے و دستاں زدہ ام
ساغرے چند بہ یادِ رخِ رنگیں خوردم   قدحے چند در آغوشِ گلستاں زدہ ام
جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست نبود   شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام

اسی غزل میں آگے چل کر کہتے ہیں:۔

آں شدائے دوست کہ آراستئے پیکرِ فن   نقشِ زیبا صنمے بر ورقِ جاں زدہ ام

آں شدائے دوست کہ در ندوہ بینی بازم	کردم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام
ہاں دہاں دست بدار یدز من اے احباب	کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام

لطیفہ:۔ شبلی نے اپنا مفہوم واضح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن جب حسن ظن سے دیوان حافظ کی شرحیں لکھی جاتی ہیں۔ بالکل اسی کو کام میں لاکر "سید سلیمان" دوسرے شعر کے "دشمنِ ایمان" کی نسبت فرماتے ہیں:۔

وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے۔ وہ غلطی سے اس دشمنِ ایماں کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا یعنی کہ وہ علی گڑھ کی تحریک سے الگ ہوکر ندوہ میں شامل ہوگئے!

دستۂ گل زیادہ تر شاعر کے اپنے جذباتِ محبت کی رنگ و بو سے مہکتا ہے لیکن ایک دو چیزیں اور بھی ہیں۔ جو ان اشعار میں بار بار آجاتی ہیں۔ چمن زارِ بمبئی کی تعریف تو کثرت سے ہے۔ پہلی غزل کا مقطع ہے ؎

دامنِ عیش ز دستم نہ رود تا شبلی
دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم

دوسری غزل تمام بمبئی کی تعریف میں ہے۔ مطلع ہے۔

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را	طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

ز ذوقِ طبعِ شبلی در اول روز دانستم	کہ در آشوبگاہِ بمبئی در باز دایماں را
بیا اینجا کہ ہر سو کاروان در کارواں بینی	بتانِ آذری را دلبرانِ شلم و ایراں را

ایک اور مضمون جو کثرت سے دستۂ گل میں نظم ہوا ہے۔ ریاکاری کا ہے۔ شبلی اپنے مشاغلِ بمبئی کا ندوۃ العلما کے مقاصدِ متبرکہ سے موازنہ کرتے ہوں گے۔

تو دل ہی دل میں ضرور ہنستے ہوں گے اور دل کا یہ چور کئی اشعار میں نظر آجاتا ہے۔ "شیشۂ تقویٰ" کی شکست کے اشعار ہم درج کر چکے ہیں۔ الٰہ آباد کی ایک غزل میں یہی بیان ہوا ہے ؎

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چہ کنم | میل با لالہ رخاں گر نہ کنم تا چہ کنم
ہست چل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش | گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقویٰ چہ کنم!

ان اشعار میں تو بے بس ہو کر راہِ تقویٰ سے انحراف کا ذکر ہے۔ لیکن بعض شعروں میں شبلی اپنے اس "تقویٰ اسی سالہ" کی اصلیت سے بھی پردہ اٹھا دیتے ہیں ؎

غیر ازیں از زندیِ من تا بہ تقویٰ فرق نیست
بر ملا ہم کردم اکنوں، آنچہ پنہاں کردہ ام!

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

از زہدِ دروغ خود بفریفتہ ام خلقے
اے دوست چہ مے پرسی تا من چہ ہنر دارم[۱]

ایک اور شعر میں یہی مضمون بیان ہوا ہے ؎

زما بگیر درسِ فنونِ ریا کہ ما
عمرے در از زاہد و مستور بودہ ایم

دستۂ گل کے اکثر اشعار خالص تغزّل کے شاہکار ہیں۔ شستہ و پاکیزہ

---

[۱] شبلی نے ایک صفحۂ کاغذ پر یہ شعر اور اس غزل کے دو اور شعر اپنے دستِ خاص سے لکھ کر عطیہ بیگم صاحبہ کو دئے تھے۔ جہاں اپنے دستخط کئے ہیں۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ "اگر در خانہ کس است، یک حرف بس است۔"

لیکن کبھی کبھی غزل گوئی کے خارجی پہلو بھی بُری طرح نمودار ہو گئے ہیں۔
اور شبلی کی بہترین غزلوں میں اس طرح کے شعر آجاتے ہیں ؎

جائے آنست کہ گلشن دہد از کنجِ لبم | بوسہ ہا بسکہ بر آں عارضِ خنداں زدہ ام
بوسہ ہا بر لبِ نوشیں زدہ ام از پئے ہم | طوطی گرسنہ ام، بر شکرستاں زدہ ام

اس قسم کے اشعار کو دیکھ کر مسٹر عبدالوحید قریشی جنھوں نے "شبلی کی حیات معاشقہ" پر رسالہ کتاب بابت اپریل ۱۹۴۵ء میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے رقمطراز ہیں۔ "اگر مولانا کا عشق اوّل اوّل حجاب کی منزل میں تھا تو اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا" ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کے اشعار کو شبلی کے لکھنوی مذاقِ شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ انھوں نے کئی چشموں سے فیض حاصل کیا تھا اور آخیر میں عام طور پر ان کا مذاق بہت سلجھ گیا تھا۔ لیکن ان کی ابتدائی ادبی تربیت اودھ پنچ اور پیامِ یار کے صفحات سے ہوئی تھی اور یہ اثر اخیر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار سے شبلی کی محبت کے جنسی یا غیر جنسی پہلوؤں پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ ان میں وہ فقط ہماری شاعری کی بعض سقیم اور مبتذل روایات کو نباہ رہے ہیں ؎

تو بدیں حسنِ تونگر چہ زیاں برداری
ایں دو بوسہ تو اگر خود نہ شماری چہ شود
مست و پُر عربدہ تنگش بکشم در آغوش
تشنۂ وصلم و تاکے بہ محابا باشم

گوئیا دشمن ہم از ذوقش نصیبے بردہ ست | بادۂ وصلش چشیدم از مذاق افتادہ بود!

دستۂ گل میں تین طرح کی غزلیں ہیں۔ پانچ ابتدائی غزلیں تو وہ ہیں۔

جو شبلی نے ستمبر ۱۹۰۶ء میں بمبئی میں یا بمبئی سے واپس جاتے وقت لکھیں۔ پھر کچھ غزلیں ہیں۔ جو الہ آباد یا لکھنؤ میں لکھی گئیں اور جن میں یا تو بیتے ہوئے لمحوں کی یاد ہے۔ یا کسی مقامی فتنہ گر کی آرزو۔ غزلوں کا زیادہ حصہ وہ ہے۔ جو دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمبئی واپس جا کر لکھا گیا۔ پہلی دو تین غزلیں تو ایسی ہیں۔ جو آسمانِ بمبئی کے عام پُر سواد منظر اور اختر و نجوم کی فراوانی کا بیان ہیں۔ لیکن چوتھی غزل دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اب اس آسمان پر ایک ماہتاب نمودار ہو گیا ہے اور مولانا کے اشعار، عام شاعرانہ جذبات کا اظہار نہیں۔ بلکہ کسی ماہِ تمام کی پرستش کے گیت ہیں۔ اس غزل میں مولانا لکھتے ہیں ؎

ہاں وہاں دست بدار بدز من اے احباب | کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام
کس چہ داند کہ بہ خلوت گہ آں ماہِ تمام[۱] | زدہ ام ساغر و بر یادِ حریفاں زدہ ام

مقطع میں تو صاف اظہار ہے ؎

شبلی ایں تازہ نوا ہا نہ چو مستانہ زدہ ام | بے تواں بُرد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست

ستمبر ۱۹۰۶ء میں تو شبلی کو ماہِ تمام کی فقط ایک آدھ جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن ۱۹۰۷ء کے آخر اور ۱۹۰۸ء کے شروع میں انھیں موقع ملا کہ وہ آرام و اطمینان سے اس کی ضیا باریوں سے حظ اٹھائیں۔ مئی ۱۹۰۷ء

۱؎ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ معارف پریس میں جو دستہ گل چھپی ہے۔ اس میں ماہِ تمام کو اسی طرح جلی قلم سے لکھا گیا ہے جس طرح دوسرے اسمائے معرفہ کو اور شبلی نے مولانا ابو الکلام آزاد کے نام کئی خطوں میں ماہِ کامل یا ماہِ تمام کا اس طرح ذکر کیا ہے۔ گویا اس سے کوئی خاص شخص مُراد ہے۔

میں ان کے پاؤں کا واقعہ پیش آیا اور وہ پاؤں بنوانے کے لئے دسمبر ۱۹۰۷ء میں روانہ ہو گئے۔ اب جب تک پاؤں تیار نہ ہو جاتا۔ ان کا بمبئی رہنا ناگزیر تھا ؎

اِسی تقریب اُس گلی میں رہے ۔۔۔ منتیں ہیں شکستہ پائی کی!

چنانچہ وہ دسمبر۔ جنوری اور فروری کے کچھ دن بہارستانِ بمبئی میں رہے۔ جلوت اور خلوت کی صحبتوں میں شریک ہوئے[۵] اور وسطِ فروری میں ندوہ کے ضروری کاموں کے لئے بالکل مجبور ہو کر اور بڑی کراہت و تکلیف کے ساتھ لکھنؤ واپس گئے۔ اس دوران میں "بڑی دلچسپیاں رہیں۔ جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں" اور پچھلے سال کی بعض غزلوں کے ساتھ ایک گلدستے میں بندھ کر دستۂ گل کے نام سے شائع ہوئیں۔

بمبئی میں مولانا شبلی کو جس خاندان سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی اس میں دو بہنیں تھیں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ۔ مولانا ان کے والد سے قسطنطنیہ میں مل چکے تھے اور ان مہمان نوازی اور وطنی محبت کے بڑے معترف تھے۔ ان دونوں بہنوں نے، اس زمانے کی مسلمان خواتین کے مذاق کے خلاف اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ پردہ نہ کرتی تھیں اور قومی کاموں

---

۵ مثلاً شروع فروری میں "بمبئی میں دو مسلم خواتین کا ایک لیکچر" تھا۔ "مردوں میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی......" شریکِ جلسہ تھے۔ (ملاحظہ ہو۔ بمبئی اخبار، ۸ فروری ۱۹۰۸ء) اس کے بعد ان خواتین نے ایک تاریخی تماشہ (TABLEAU تابلو) کرنا چاہا تو تاریخی معلومات شبلی نے فراہم کیں۔ لیکن افسوس کہ تماشے کے انعقاد سے پہلے انھیں لکھنؤ جانا پڑا۔
(ملاحظہ ہو عطیہ بیگم صاحبہ کی (قلمی) خاندانی ڈائری)

میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا چاہتی تھیں۔ مولانا ان سے بڑے متاثر ہوئے اور ان دونوں کے نام ان کے جو مکتوبات خطوطِ شبلی کے نام سے شائع ہوئے ہیں وہ مولانا کی زندگی کے ایک غیر معروف گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں اور یہ دستۂ گل اور بوئے گل کی عقبی سرزمین کو نمایاں کرتے ہیں۔

خطوطِ شبلی میں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ دونوں کے نام خطوط ہیں لیکن زیادہ تر عطیہ صاحبہ سے خطاب ہے۔ اور مولانا کو اس قابل اور باکمال بست ساله لڑکی نے جس طرح مسحور و بیخود بنا دیا تھا۔ اس کا اندازہ خطوطِ شبلی کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے۔ وہ عطیہ بیگم کی بعض خوبیوں کا ذکر کرکے انھیں لکھتے ہیں۔

لہ منتشر خطوط اور مبہم اشعار کی بنا پر کسی کی داستانِ دل مرتب کرنا آسان نہیں لیکن جب فریقین میں سے ایک شبلی کی سی قومی اہمیت رکھتا ہو اور دوسرا پرائیویٹ خطوط کو اشاعت کے لئے حوالے کردے تو پھر اس داستان کی ترتیب ناگزیر سی ہوجاتی ہے چنانچہ خطوطِ شبلی کی اشاعت کے بعد "شبلی کی حیات معاشقہ" اور اس قسم کے عنوانوں سے رسائل میں مضامین چھپے ہیں۔ حال میں مولوی محمد امین زبیری نے شبلی کی زندگی کے رنگین پہلو پر ایک مختصر سا کتابچہ لکھا ہے۔ اور ہم نے بھی سطور آئندہ میں خطوطِ شبلی اور غزلیات شبلی کو ایک لڑی میں پرونا چاہا ہے۔

ان تحریروں میں غلطی اور غلط فہمی کی گنجائش ہے لیکن خوش قسمتی سے پچھلے دنوں خود عطیہ بیگم صاحبہ کے قلم سے مولانا شبلی اور خاندان فیضی کے تعلقات پر ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے جسے ہم اس کی اہمیت کے لحاظ سے ضمیمہ کے طور پر تمام کا تمام نقل کرتے ہیں۔ تاکہ غلط فہمیوں کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ (باقی آگے دیکھیے)

ان باتوں کے ساتھ اگر موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں۔ وانا اوّل العابدین (اور میں سب سے پہلا پجاری ہوں گا!)

ایک خط کا آغاز ہے:۔

رنگِ سنگم، شرارے مے نویسم
کفِ خاکم، غبارے مے نویسم

قرۃ عینی! تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگایا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔

ایک اور جگہ، اپنے ایک شعر کا، جس میں کنایتہً عطیہ صاحبہ کا نام آتا تھا۔ لکھتے تھے۔

اسی اصول پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتاً تمہارے لئے خیر مقدم وغیرہ سب لکھ چکا ہوں اور عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

عطیہ بیگم صاحبہ کے مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے گھر میں مولانا کا استقبال بطور ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح" ہوا لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات بھڑک اُٹھے۔ جن کی تندی و تیزی سے وہ بے خبر تھیں۔

ہمارے خیال میں عطیہ بیگم صاحبہ کے اس اظہار کو، بغیر کسی تامل و تردد کے، درست مان لینا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ خطوطِ شبلی اور غزلیات بمبئی میں ایک آگ بھڑکتی ہے۔ لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی عطیہ بیگم صاحبہ نے کوئی بھی کوشش کی تھی انھوں نے شبلی کو "بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا" لیکن "دیوانہ را ہوئے بس است"۔ شبلی کے "زود اشتعال" جذبات بھڑک اُٹھے جن کا اظہار فارسی غزلیات اور اُردو خطوط میں ہوا۔

ہر رونگٹا اور رہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے!

خطوطِ شبلی مشرقی ادب میں ایک بالکل انوکھی چیز ہے۔ بظاہر تو یہ چند صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے لیکن ان چند صفحات میں ہی محبت کا ایک مکمل ڈرامہ آگیا ہے۔ (اور اس انداز سے کہ اس میں آورد اور تصنع کا شائبہ تک نہیں) ان خطوط میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ندی ہے جو پہاڑی چشموں سے پھوٹتی ہے۔ پہلے گلزاروں اور مرغزاروں کی سیر کرتی ہے۔ پھیلتی ہے اور تیز تر اور تند تر ہوتی جاتی ہے۔ پھر یک لخت تغافل اور عتاب کے صحرا میں جاکر آنکھ سے نہاں ہو جاتی ہے۔ خطوط شبلی میں محبت کی چہلیں ہیں۔ حسن و عشق کے راز و نیاز ہیں اور آخیر میں حسن کا جلالی رنگ جھلکتا ہے۔

علامہ شبلی اردو زبان کے بہترین مکتوب نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے مکاتیب کے جو دو مجموعے دارالمصنفین نے شائع کئے ہیں ان میں ایک خاص شان ہے اور وہ شبلی کے رنگِ انشا پردازی اور ایجاز کے نہایت خوشگوار نمونے ہیں لیکن ان میں ایک طرح کا تصنع اور آورد ہے۔ یوں تو بلادِ پورب کی وضعدار اور باتکلف سرزمین سے دورِ حاضر میں جتنے خطوط لکھنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ (مثلاً مہدی حسن۔ نیاز فتحپوری) ان میں سے کسی کے خطوط بھی بے تکلف اور نیچرل نہیں۔ لیکن شبلی کی احتیاطِ قلم کی ایک خاص وجہ تھی۔ انھیں شروع سے ہی اپنی قابلیت اور صلاحیتوں پر اس طرح کا اعتماد تھا کہ وہ اپنے خطوط قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھتے تھے۔ وہ ابھی بیس برس کے ہیں اور دس روپے کی محافظی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن خط

لکھیں گے تو فارسی میں اور اخیر میں کہیں گے "نامہ را نگاہ دارید" چنانچہ ان کے اس زمانے کے بعض خط محفوظ ہیں (مولانا کی اس خصوصیت نے ان کے مکاتیب میں ایک ادبی شان پیدا کر دی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں وہ بے تکلفی اور انتہائی خلوص نہیں جو خطوطِ شبلی کا زیور ہے) جن کی نسبت مولانا کو کبھی اس بات کا وہم بھی نہ ہوگا کہ ان کی اشاعت کی نوبت آجائے گی!

ہم خطوطِ شبلی سے طویل اقتباسات نہیں دینا چاہتے (جس کسی کو انسانی نفسیات، ادب، یا شبلی کی ذات سے کوئی دلچسپی ہے۔ وہ اس گلستان کی خود سیر کرے گا اور ایک ایک پھول، ایک ایک پتی کا بغور معائنہ کرے گا۔ لیکن ان خطوط سے بعض مسائل کی نسبت شبلی کا بالکل نیا زاویۂ نگاہ نظر آتا ہے اور ان میں سے ایک آدھ کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔

سید سلیمان لکھتے ہیں "مولانا (شبلی) پردہ کے سخت مؤید تھے۔ اسی لئے مسٹر امیر علی کا جواب لکھا۔ بعنوانِ پردہ اور اسلام"۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۹۹ء میں رائٹ آنریبل سید امیر علی نے ایک انگریزی رسالہ میں مسلمان عورتوں کے متعلق ایک مضمون لکھا۔ جس میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان میں آج کل جو پردہ رائج ہے۔ وہ قرآنی نہیں اور ظہورِ اسلام کے بہت بعد مسلمانوں میں رائج ہوا۔ شبلی نے چند برس بعد الندوہ میں اس کا جواب لکھا اور کہا کہ عرب میں پردہ کا رواج اسلام سے بعد کا نہیں بلکہ پہلے کا ہے اور شعرائے جاہلیت کے کلام سے طویل حوالے دے کر ثابت کیا کہ ظہورِ اسلام سے پہلے تو عرب کے بعض قبیلوں میں مرد بھی "برقع پہن کر" اور "چہروں پر نقاب" ڈال کر گھر سے باہر نکلتے تھے!!

اپنے مضمون میں علّامہ شبلی نے نہ صرف "نئے تعلیم یافتہ گروہ کے سب سے مشہور اور مستند مصنّف" کے "مبلغ علم" کا مذاق اُڑایا بلکہ لگے ہاتھوں امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے "مبہم" ترجمۂ قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔ جس پر سید امیر علی نے اپنے دعوے کی بنیاد رکھی تھی۔

جب علامہ شبلی نے اپنا مضمون لکھا تو اس وقت ان کی پہلی بیوی کی وفات ہو چکی تھی اور وہ نسوانی اثرات سے بالکل آزاد تھے۔ شبلی کے دوست مہدی حسن صاحب نے اس مضمون پر چند سال بعد تبصرہ کیا اور نہایت لطیف اور رمودبانہ طریقے سے عورتوں اور پردہ کے متعلق شبلی کے خیالات کی شکایت کی اور انھیں مخاطب کر کے یہ شعر نقل کیا ؎

ترا گاہے گریبانے نہ شد چاک
چہ دانی لذّت دیوانگی را!

مہدی صاحب کو کیا معلوم تھا کہ ایک دو سال کے اندر شبلی کا گریبان کس طرح چاک ہوگا اور وہ نئے میدان میں بھی حقوق نسواں کے حامیوں سے کس طرح بازی لے جائیں گے۔ ان کے مضمون کو کوئی سال دو سال نہ گزرے ہوں گے کہ شبلی کے آسمانِ محبّت پر ایک ماہتاب طلوع ہوا جس نے ان کے خیالات میں عجیب طرح کا تموّج پیدا کر دیا۔ یوں تو عطیہ بیگم کے

لہ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ امر ظاہر کر دیا جائے کہ جب اخیر عمر میں شبلی نے عیسائی مصنفوں اور معترضوں کے جواب میں سیرت النبی لکھنی شروع کی اور دیکھا کہ اس میدان میں ان سے پہلے سرسید اور سید امیر علی کتنا کام کر چکے ہیں تو ان کے دل میں ان دونوں کے علمی کارناموں کی قدر بڑھ گئی۔ سرسید کے خطبات کا ذکر انھوں نے تعریف کے پیرائے میں کیا ہے اور "مولوی امیر علی" کی علمی فضیلت کی تو کئی جگہ بالصراحت تعریف ہے۔

نام شبلی کے تمام خطوط ان کی طبیعت کے انقلاب کا پتہ دیتے ہیں۔ لیکن عورتوں کی تعلیم کے متعلق دونوں کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی۔ اس سے تو خاص طور شبلی کی شخصیت کے بعض غیر معروف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق عطیہ بیگم صاحبہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انھیں عام دنیوی اور معاشی علوم کی تعلیم سے مردوں سے آزاد اور بے پروا کرنے کی ضرورت نہیں اور ان کی تعلیم مردوں سے مختلف ہونی چاہئے۔ اس پر مولانا انھیں لکھتے ہیں :۔

عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل کے کہ عورتیں ان کی دستنگر نہیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان۔ پان۔ چھوٹی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن۔ نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی۔ دلیری۔ دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن وجمال قائم رہ سکتا ہے۔ مردنا عورتیں زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔

جواب میں عطیہ صاحبہ نے اپنی رائے پر اصرار کیا اور غالباً دیو پیکر عورتوں کے خلاف کچھ لکھا۔ لیکن مولانا کی دماغی گہرائیوں میں جو نسوانیت پنہاں تھی۔ اس کا تقاضا کہ وہ محبوب کو بھی مردانہ رنگ میں زیادہ پسند کریں۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں :۔

عورتوں کی دیو پیکری پر تم نے اس قدر طولانی تحریر لکھی لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلّم ہے کہ صحت کے لئے تندرستی کے لئے جسم

کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہوجاتا ہے۔ یہ صرف میری رائے نہیں۔ بڑے بڑے اہلِ نظر کا یہی فیصلہ ہے۔ کاؔفی ہمدانی کے قصیدے سے چند شعر لکھتا ہوں۔

گُردانِ جہاں اند ہژبرانِ زماں اند	میرانِ سپاہ اند عروسانِ وثاق اند
چوں سنگ ہمہ سخت دل وسخت کماں اند	چوں سیم ہمہ پاک تن و پاک جبیں اند
بر مرکبِ تازی ہمہ چوں بادِ فراں اند	با قرطۂ رومی ہمہ چوں بدرِ منیر اند
مانند ہژبر اند چو با تیغ وسناں اند	مانند تدروند چو با جامِ شراب اند

جمالیاتی نقطۂ نظر کے علاوہ حقوقِ نسواں کا یہ نیا ترجمان عورتوں کو مرد بننے کی اس لئے بھی تلقین کر رہا تھا کہ وہ مردوں سے اپنے حقوق واپس لے سکیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک عورتیں نازک ہی بنی رہیں گی مردان کو پورے حقوق نہ دیں گے۔

شبلیؔ نے اپنی رائے کی تائید میں بڑی محکم دلیلیں دیں لیکن ان کا مقابلہ مردانہ رنگ کی ایک مستقل مزاج عورت سے تھا۔ بالآخر انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس میں بھی انھوں نے ایک جذباتی لذتِ محسوس کی عطیہ کو لکھتے ہیں:۔

مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیہ! میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں۔

خطوطِ شبلی میں تو ان رازونیاز کی باتوں اور دلی خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ لیکن شبلیؔ کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی تھا جس کا ترجمان الندوہ تھا۔

اور جس کا اظہار اس مضمون میں کیا گیا تھا۔ جو سید امیر علی کے خیالات کی تردید میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بھی اس رسالے میں عورتوں اور ان کی تعلیم کے متعلق اس طرح کے خیالات ظاہر ہوتے رہے۔ جو شبلی چند سال پہلے خود ظاہر کر چکے تھے۔ لیکن اب ان سے باز پرس کرنے والی ہستیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب مسٹر مشیر حسین قدوائی نے اسی رنگ کا ایک مضمون الندوہ میں چھپوایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ عورتوں کی تعلیم محدود ہونی چاہئے۔ تو عطیہ بیگم صاحبہ نے فوراً مولانا شبلی کو ڈانٹ کر لکھا:۔

ایسے مضامین آپ کو شائع نہیں کرنے چاہئیں۔

مولانا نے پھر ہتھیار ڈال دئے اور نہایت معذرت آموز پیرائے میں جواب دیا:۔

مشیر حسین صاحب کا مضمون میں نے چھپنے سے پہلے ہرگز نہیں دیکھا کسی نے غلط تم کو لکھ دیا۔ ہاں میں نے کسی قدر اس کو پسند کیا تھا یعنی طرز عبارت کے لحاظ سے۔ ورنہ مجھ کو خود اس مضمون پر اعتراض ہے اور اس کو ناقابلِ عمل قرار کرتا ہوں۔

افسوس، مشیر حسین صاحب نے شبلی کا اپنا الندوہ والا مضمون، عطیہ صاحبہ کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔ ورنہ وہاں سے جو ڈانٹ ملتی اور شبلی جس طرح معذرت خواہی میں سرِ نیاز جھکا دیتے۔ یا اپنے مضمون کی تاویلیں کرتے۔ اس کا تصور ہی لطف انگیز ہے ؎

بڑا مزہ ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوے
وہ منتوں سے کہیں چپ ہو خدا کے لئے!

خطوطِ شبلی کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ دستہ گل کی بعض غزلیں

اسی نشے کا اثر تھیں جس نے خطوطِ شبلی کو ایک خمکدۂ محبت بنا دیا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی غزل کس لمحے کی یادگار ہے اور اس میں کس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ آسان نہیں۔ یہ تو ایسا کام ہے۔ جسے اگر "عالم السرائر" مولانا ابوالکلام آزاد (جو بمبئی کی بعض رنگین صحبتوں میں شبلی کے شریک تھے) چاہیں[۱] تو بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور دلدادگانِ شبلی کو ممنونِ کرم کر سکتے ہیں لیکن اس زمانے میں شبلی پر جو عام کیف و مستی چھائی تھی۔ اس کا اندازہ دستۂ گل کے اشعار سے بھی ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اسمے نماند خلوتیانِ حجاز را | دیدی تطاولِ خمِ زلفِ دراز را
ہرگز بکے بہ خوبی و رعنائی تو نیست | ما دیدہ ایم کج کلہانِ طراز را
بیچارہ نکتہ دانِ اداہائے عشق نیست | ضائع مکن بہ غیر نگہ ہائے راز را
ہر چند جور نیز ز معشوق خوش بود | ما بندہ ایم دلبرِ عاشق نواز را
آذر برم کہ کار ز اندازہ درگذشت | دستِ دراز گشتہ و آغوشِ باز را

شبلی اس عالمِ سرخوشی میں مستغرق تھے کہ انھیں مجبوراً ندوہ کے ضروری

---

[۱] مولانا ابوالکلام آزاد کا شاید عطیہ بیگم صاحبہ سے اسی زمانے میں تعارف ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ نے ہمیں شبلی کے کاغذات کا جو پلندا حوالے کیا۔ اس میں مولانا کے بھی دو خطوط تھے۔ ایک ۱۹۲۳ء کا ہے۔ اس کا آغاز تھا۔ "یاد فرمائی کا شکریہ۔ بلاشبہ ایک گرفتاری سے تو رہائی مل چکی ہے لیکن اور کتنی ہی گرفتاریاں باقی ہیں۔ اس گرفتاری کی تو طلب تھی انکار نہ لیکن بعض گرفتاریاں ایسی بھی ہیں کہ چھوٹنا چاہیں بھی نہیں چھوٹ سکتیں مثلاً آپکے لطف و عنایت کی اسیری ع

خلاص حافظ ازاں زلفِ "تابدار مباد!"

کاموں کے لیۓ بمبئی کو الوداع کہنا پڑا لیکن اب انھوں نے وہ روابط جو بمبئی میں قائم ہو گئے تھے ۔ برقرار رکھے اور لکھنؤ پہنچتے ہی عطیہ اور زہرا کو خطوط لکھے ...... ان خطوط کا سلسلہ ۱۷ فروری ۱۹۰۶ء سے شروع ہوا

اور ایک طرف سے محبت اور عقیدت اور دوسری طرف سے ادب واحترام کے جو بیج بوئے گئے تھے ۔ وہ جڑ پکڑتے گئے لیکن ابھی چار پانچ خطوں ہی کی نوبت آئی تھی کہ عطیہ بیگم کو یورپ کا سفر پیش آیا ۔ پہلے مولانا کا "ارادہ اور قطعی ارادہ" تھا کہ وہ الوداع کہنے کے لئے خود بمبئی آئیں لیکن پھر اس خیال سے رُک گئے کہ ان کے لئے کسی عزیز دوست کی رخصت کے وقت تحمل کرنا بڑا دشوار تھا ۔ چنانچہ انھوں نے دور سے خدا حافظ کہا اور ڈاک سے وداعیہ نظم بھیج دی ۔ ساتھ ہی ایک خط لکھا جس میں کے آخر میں ایک فارسی شعر تھا ۔

مے روی و گریہ مے آید مرا
ساعتے بنشیں، کہ باراں بگذرد!

شبلی نے عطیہ سے سفر یورپ کے دوران میں خط وکتابت جاری رکھی ۔ لیکن وہ خطوط محفوظ نہیں رہے ۔ جب وہ اکتوبر میں اس سفر سے واپس آئیں تو شبلی نے ایک ایسا خیر مقدم لکھا جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا ۔ بوئے گل کی پہلی غزل ہے ۔

پیکِ فرخندہ قدم مژدہ سرائے آید ۔ کز سفر یار سفر کردۂ ما مے آید
رفت از شہر بداں ساں کہ بہاراں ز چمن ۔ آمد آں گونہ کہ در باغ صبا مے آید
گوئیا یوسف گم گشتہ بہ کنعاں آمد ۔ یا نگارِ یمنی سوئے سبا مے آید
رفتنش گرچہ بہ کامِ دلِ احباب نہ بود ۔ چوں بیامد بہ مرادِ دلِ ما مے آید

خوئے خویش بہماں لطف و صفا ہست کہ بود | ہم بداں قاعدۂ مہر و وفا مے آید
بوئے جانے کہ مشامِ دل و جاں تازہ کند | مے تواں یافت کزاں بندِ قبا مے آید
ہر کجا مے گذرد، عطر فشاں مے گذرد | ہر نسیمے کہ ازاں زلفِ دوتا مے آید
اے دعائے سحر از چرخ فرود آ اکنوں | کاں کہ بے خواستنی او را بدعا مے آید

شبلیِ غمزدہ آورد دل و دیں بہ نثار
غیر ازیں چیست کہ از دستِ گدا مے آید

لیکن شاید خیر مقدم ضرورت سے زیادہ شوخ سمجھا گیا اور مولانا کی مصلحت پسند طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اسے عطیہ تک پہنچا ئیں۔ اس کے لئے خیرِ مقدم کا ایک ایک اور قطعہ لکھا گیا۔

نسیمِ صبح بیا و بہ مردمی پیش آ
پیام بندہ بہ آں خاکِ آستاں برساں

اس کے بعد خطوط کا سلسلہ پھر سے جاری ہوا اور شناسائی دوستی اور دوستی بے تکلفی میں تبدیل ہو گئی۔ مولانا شبلی کے سب سے محبت بھرے خطوط عطیہ بیگم کی ولایت سے واپسی کے بعد لکھے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مایوسی و کشمکش کے بھی کئی دور آئے اور جو رنگین خواب کی نگہ تصور نے دیکھے تھے۔ ان کا پورا ہونا محال ہو گیا۔ واپس آکر عطیہ صاحبہ نے جو پہلا خط لکھا۔ اس کے لب و لہجہ کی شبلی شکایت کرتے ہیں :۔

میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالاتر کر دیا ہے اس لئے یہ توقع کہ آپ اسی طرح ہم سے ملیں۔ یا ان اطراف کا قصد کریں۔ جیسا کہ وعدہ کیا تھا۔ اب صحیح نہیں خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خوددارانہ ہے۔

جس روز شبلی نے یہ شکایت لکھی۔ اس سے اگلے روز یعنی ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء

کی ایک غزل میں بھی اسی مایوسی و ناکامی کا اظہار ہے ؎

زجاں گذشتم و بازم بہ بر نمے آید کہ نیست زور مرا و آں بت بہ زر نمے آید
فراق و ہجر دیارِ خوشے بود کہ درو پس از گذشتنِ شب ہم سحر نمے آید
جدا از دوست شب ماہتاب را چکنم کہ کارِ عارض او از قمر نمے آید
بہ خوارئے کہ ز کوئے تو رفت نعمانی
گماں برم کہ ازیں پس دگر نمے آید

اس کے سات روز بعد کی ایک غزل میں یہ اظہار اور بھی صاف ہے ؎

آں شوخ را بہ من سرِ آں پرسش و جو نماند یعنی گلِ مراد مرا رنگ و بو نماند
ہر چند آں نوازشِ ظاہر ہماں بجاست پیداست ایں کہ آں روشِ پرسش و جو نماند
شبلی ہر آنچہ داشت بہ دل بر زباں فگند گویا کہ کار با صنمِ تند خو نماند

اب حسرتیں امیدوں پر غالب آ گئیں اور کیف آور آرزوؤں کی جگہ سوہان روح یادوں نے لے لی۔ ماضی کے پرکیف لمحوں اور یہ خوابہائے رنگیں کو یاد کر کے کہتے ہیں ؎

یک سر و صد گونہ سودائے نہانے داشتم یاد آں روزے کہ من با خود جہانے داشتم
یاد آں روزے کہ دور از ماجراہائے جہاں ماجرائے با نگارِ نکتہ دانے داشتم
یاد آں روزے کہ دست افشاں گذشتم از حرم از غرورِ آں کہ من ہم آستانے داشتم
ہیچ باک از گردشِ گردونِ گردانم نہ بود کز زمین کوچۂ او آسمانے داشتم
یاد آں روزے کہ من از سادہ لوحی ہائے خود با عدو نے گفتم از رازِ نہانے داشتم
شبلیا آں جلوۂ نیرنگہائے بمبئی
بود تا وقتے کہ من خوابِ گرانے داشتم

بوئے گل میں جس میں ۱۱ اکتوبر سے ۵ نومبر تک کے احساسات نظم ہوئے ہیں۔ نومیدی و تلخ کامی کے کئی لمحے ہیں۔ شبلی خود مانتے تھے کہ دستۂ گل

اور بوئے گل میں جذب و سلوک کا فرق تھا۔ ایک میں جذب و سرمستی کے ایام کی داستان ہے اور دوسرے میں سالکِ راہِ محبت کو جن دشواریوں و نشیب و فراز سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان کا بیان ہے۔ ایک میں بلبل ہزار داستاں کے سامنے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ اور دوسرے میں اسے ایسا نظر آتا ہے کہ پھول تو جاتے رہے۔ فقط بوئے گل باقی ہے۔ دوسرے مجموعے میں مایوسی اور ناکامی کا کثرت سے ذکر ہے لیکن جس طرح شبلی کی آرزوئیں اور اُمیدیں بے ثمر ثابت ہوئیں۔ اسی طرح انتہائی مایوسیاں بھی بلاوجہ تھیں۔ بلکہ ان غزلوں کو لکھے ہوئے ایک مہینہ نہ ہوا تھا کہ انھیں خاص لکھنؤ میں اپنے ممدوح کے خیر مقدم کا موقع ملا۔ شبلی ۲۴ نومبر ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں :-

"بمبئی کا مہمان (ماہ مان) آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جز کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ نہ وقت۔ نہ دماغ۔ حسرت کا کبھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزر رہے ہیں۔ اُردو۔ فارسی۔ انگریزی۔ فرنچ۔ زبان دانی۔ مصوری۔ نقشہ کشی۔ پالٹیکس۔ قوتِ تحریر۔ ع آنچہ عالم ہمہ می داشتند تو تنہا داری۔ افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی۔ ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں"

اس کے بعد خطوط میں زیادہ یگانگت اور بے تکلفی آگئی اور شبلی نے اپنی بعض آسان اور قابلِ اعتراض غزلوں کے اشعار عطیہ کو تفصیلی شرح

کے ساتھ ارسال کئے۔ اگلے سال انھوں نے چند روز جنجیرہ (بمبئی) میں مونٹ روڈ پر رہنے کی خواہش ظاہر کی[1] چنانچہ جزیرہ سے جہاں عطیہ کی بڑی ہمشیرہ نازلی بیگم صاحبہ نواب صاحب سے بیاہی ہوئی تھیں شبلی کو دعوت آئی وہ اپنی بیٹی فاطمہ کو سخت بیماری میں مبتلا چھوڑ کر دہلی بمبئی ہوتے ہوئے جنجیرہ گئے اور کئی دن تک اپنے کرمفرماؤں اور دوستوں کے ساتھ مقیم رہے۔ اسی زمانے کی اردو غزل ہے۔

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی تو کیوں ہوگی
خیال روزہ و فکرِ وضو ہو گی تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کرے گا اس قصرِ معلیٰ میں
اسے خلد بریں کی آرزو ہو گی تو کیوں ہوگی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہوگی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہو گی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف۔ یہ منظر۔ یہ سبزہ۔ یہ بہارستان
عطیہ! تم کو یادِ لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہوگی

جنجیرہ سے رخصت ہوئے۔ تو واپس جا کر ایک قطعہ لکھا۔ جس میں جنجیرہ کی صحبت ہائے رنگیں کو یاد کر کے کہا ہے۔

یاد صحبتہائے رنگیں جو جنجیرہ میں ہیں وہ جنجیرہ کی زمیں تھی۔ یا کوئی میخانہ تھا

---

[1] خطوط شبلی (شمار ۲۰)

لطف تھا۔ ذوقِ سخن تھا۔ صحبتِ احباب تھی ۔۔۔ مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامنِ کہسار سب ۔۔۔ غیرتِ خلدِ بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا
غنچۂ گل کا تبسم تھا۔ ہر اک دم برق ریز ۔۔۔ عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہِ مست ساقی اس قدر ۔۔۔ خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن ۔۔۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

مولانا ایک خط میں بھی جزیرہ کی صحبتوں کو یاد کر کے کہتے ہیں۔ "جزیرہ کا خواب بیداری میں بھی نظر آتا ہے"۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جنجیرہ کا سفر، جس کے لئے انھوں نے اپنی پیاری بیٹی کو بسترِ مرگ پر دراز چھوڑا تھا۔ ان کے لئے بہت مبارک ثابت نہ ہوا اور حریمِ دوست کی کوئی چیز انھیں، برابر، کھٹکتی رہی۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک معذرت آمیز انداز میں جنجیرہ کے تعریفی قطعہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ اشعار "آب و ہوا کی لطافت نے اس وقت ارتجالاً" لکھوائے تھے[1] اور یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس سال انھوں نے بمبئی اور جزیرہ کے قیام میں کوئی غزل نہیں لکھی۔ مہدی حسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں بمبئی سے بالکل خالی ہاتھ آیا ایک غزل کا سرمایہ بھی نہ ہو سکا۔ اس شکایت میں ایک غزل لکھی۔ وہ بھی وہاں سے "نکل کر" اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

---

[1] جنجیرہ کی تعریفی غزل کی نسبت عطیہ بیگم کی خاندانی ڈائری میں ذیل کا اندراج ہے:۔
آخر مولانا شبلی صاحب اور مشیر حسین قدوائی صاحب یہاں تشریف لائے۔ مدتوں سے وعدہ تھا مگر بارے شکر کہ اجرا ہوا۔ اکتوبر کو یہاں آئے اور ہفتہ بھر ٹھہرے۔ مولوی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی چند اشعار اس جگہ کے متعلق کہے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت جوش میں آگئی اور یہ غزل کوئی دو گھنٹے کے عرصے میں لکھ کر بھیج دی ؎ کسی گویاں خدا ...... الخ

داغم کہ بہارِ چمنِ بمبئی امسال
بر سادتِ پیشینہ جنوں خیز نہ بودہ است!

حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آرہا تھا کہ شبلی کے خوابہائے رنگیں خوابہائے پریشاں ہوجائیں۔ وہ عطیہ بیگم کی قابلیت۔ ذہانت۔ وسعت معلومات کے معترف تھے اور عطیہ ان کی انشا پردازی اور تصنیفی شہرت کی قدر کرتی تھیں۔ لیکن ان کی عمروں اور طبیعتوں میں جو تفاوت تھا وہ کسی پائدار دوستی کے لئے سازگار نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شبلی اس تفاوت عمر کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب زہرا نے ایک دفعہ شبلی کی صاحبزادیوں کو بہن کہکر خطاب کیا تو شبلی نے فوراً انھیں ٹوکا:۔

ہاں۔ آپ نے پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا ہے۔ عزیزانہ تعلق تو قطعی ہے لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسن صاحب مرحوم (زہرا اور عطیہ کے والد) عمر اور ہر حیثیت سے میرے چچا تھے۔ اسی لحاظ سے یہ رشتہ قائم ہونا چاہئے میری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے اور اس لئے اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں۔

شبلی اور عطیہ میں شاید تیس سال کا فرق تھا۔ ان دونوں کے درمیان خیالات کی ہم آہنگی ہی بڑی مشکل تھی لیکن بعض واقعات بھی ایسے رونما ہوئے جو بادیہ پیمائے محبت کے لئے سنگ راہ ثابت ہوئے۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے عطیہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مدرسہ ندوۃ العلما کا سنگ بنیاد ان کی ہمشیرہ نازلی بیگم سے رکھوایا جائے لیکن ندوۃ کے علما تو عطیہ بیگم کو بھی اپنے جلسوں میں نہیں آنے دیتے تھے۔ وہ ان کی ہمشیرہ کے سنگ بنیاد رکھنے پر کس طرح راضی ہوتے۔ چنانچہ شبلی نے "عام مخالفت

اور مولویوں کی برہمی" کا عذر پیش کیا جو فی الحقیقت بجا تھا۔ لیکن ایک بیست سالہ لڑکی ان پیچیدگیوں کو کیا سمجھے۔ وہ جب خطوں اور نظموں میں شبلی کا والہانہ اظہارِ محبت دیکھتی تو ان مصلحت بینیوں پر حیران رہ جاتی چنانچہ عطیہ نے مولانا کا عذر تسلیم نہ کیا اور انھیں "بدہمتی" کا طعن دیا۔ اس کے جواب میں شبلی نے لکھا:۔

تم کہتی ہو کہ میں "بہت بدہمت" ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں۔

تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔

شبلی نے بیگم صاحبہ کے سنگِ بنیاد والی تجویز پر تو عمل نہیں کیا لیکن جب ان کی ہمشیرہ نے ندوہ کی امداد کے لئے کچھ رقم ارسال کی تو اس کے شکریے کا خط لکھا۔ اس کا ایک شعر تھا۔

نازم کہ ایں عطیۂ فیضِ امیرہ ایست\
کآوازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ است

بدقسمتی سے لفظ عطیہ کا یہ کنایتہً استعمال بھی اختلاف کا سبب بن گیا۔ اور جنجیرہ سے نکل کر شبلی نے ایک طول طویل خط اس کی معذرت میں لکھا۔

اسی زمانے میں رسالہ الندوہ میں مسٹر مشیر حسین قدوائی کا مضمون عورتوں کی تعلیم کے متعلق شائع ہوا۔ جس پر عطیہ بیگم نے اعتراض کیا۔ اس کے دو تین مہینے بعد ناخوشگوار بحث کا ایک اور موقع پیش آیا۔ عطیہ صاحبہ نے اپنے

اپنے کسی خط میں علی گڑھ جانے کا ذکر کیا تھا۔ شبلی کو اس زمانے میں علی گڑھ سے ایک خدا واسطے کا بغض پیدا ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا جنھیں مکتوب الیہ نے علی گڑھ کی بلاوجہ تحقیر سمجھا اور بہت برہم ہوئیں۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے!

چنانچہ اُنھوں نے ایک غضب آلود خط شبلی کو لکھا۔ جس کے جواب میں شبلی نے ۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو اپنا مفہوم زیادہ واضح کیا اور معذرت چاہی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے دل صاف نہیں ہوئے۔ اب لفافے میں "عزیزی" کی جگہ "خاتونِ محترم" نے لے لی اور خطوط کا لب و لہجہ یک لخت بدل گیا۔ مدت کے بعد، جب اُدھر سے ایک شفقت بھرا خط آیا تو شبلی کے تصور نے پھر انگڑائی لی اور دفعتاً بہت سے مردہ خیالات زندہ ہو گئے" لیکن یہ تخیر عارضی تھا۔ شبلی کے دل میں عطیہ کی یاد ایک لطیف خوشگوار نقش کی طرح محفوظ رہی۔ کبھی کبھی ملاقاتیں بھی ہوئیں لیکن ٹوٹے ہوئے دل پھر جڑ نہ سکے اور دو چار رسمی خطوط کے بعد، خطوطِ شبلی کا رنگین باب ختم ہو جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۹ء کے آخر میں جب شبلی کو بمبئی کا چشمۂ محبت سراب بنتا نظر آیا۔ تو اُنھوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ مہدی حسن کو اسی خط میں جس میں بمبئی سے خالی ہاتھ آنے کی شکایت کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

الہ آباد بلایئے تو آجاؤں لیکن شرط یہ ہے کہ بمبئی کا نعم البدل نہ سہی۔ برابر سرابر تو ہو کیا اُمید ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد اُنھوں نے کئی خطوں میں الہ آباد اور مرزاپور کی نسبت اشارے کئے لیکن مہدی حسن ٹال گئے۔ اس پر بعض لطیف اشاروں کے بعد مولانا ایک خط میں صاف صاف لکھتے ہیں :-

مجھ کو رنج تھا کہ اب آپ قابلِ خطاب بھی نہیں سمجھتے۔ بمبئی اور الہ آباد دونوں صدائیں بیکار گئیں!

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا یہ چاہتے تھے کہ بیگم مہدی ان سے پردہ نہ کریں۔ ایک خط میں اس کی نسبت لطیف اشارہ ہے۔

آپ تو پردۂ نسواں کے مخالف تھے اور اس پر عمل بھی فرمایا لیکن تلافی یہ کی کہ مردوں کو پردہ میں بٹھا دیا۔ اس صورت سے مجھ کو بھی اختلاف نہیں۔ بات ایک ہی ہے۔

ایک اور خط میں ہے:-

واقعی سخت تعجب ہے کہ آپ وعدہ کر کے میزبانی کرنے سے کترا گئے۔ خیر کوئی مصلحت ہو گی۔

مہدی حسن کے نام مولانا کے خطوط میں ایسی مبہم اور معنی خیز عبارتیں کئی ہیں۔ لیکن آخری خط سے کچھ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس خط کے بالکل آخر میں کہتے ہیں:-

.... لیکن آپ یا بھاوج صاحبہ ہر دفعہ دامن بچا جاتے ہیں ہم جیسے نفوس قدسیہ سے پردہ! اور وہ بھی ساٹھ برس کے بعد!!!

شبلی کے دل و دماغ پر ان دنوں ایک عجیب مستی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کا شفاف ترین اظہار مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کے ان خطوں میں ہے۔ جو مکاتیب شبلی کی پہلی اشاعت میں نہ تھے لیکن دوسرے ایڈیشن میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ آزاد کے نام شبلی کے پہلے دو خط اس زمانے کے

ہیں۔ جب آزاد کی عمر سترہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے بعد کوئی ساڑھے تین سال کا وقفہ ہے۔ پتہ نہیں۔ اس دوران کے خطوط محفوظ نہیں رہے۔ یا کسی مصلحت کی بنا پر ان کی اشاعت روک دی گئی۔ پہلے دو خط بالکل رسمی رنگ میں ہیں لیکن تیسرا پڑھیں تو عالم ہی اور نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ازاں بہ دردِ دگر ہر دماں گرفتارم
کہ شیوہ ہائے ترا با ہم آشنائی نیست

بھائی! تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کر دی ہے کہ الیاس احل ہی لو احتیں لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکا لگا دیتے ہو۔ خیر جو مرضی، یہ بھی منظور!

کلکتہ گیا۔ ایک خاص کام تھا...... دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں لیکن ع

چہ حظ خضر برد از عمرِ جاوداں تنہا

اس خط سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ بمبئی کی ایک کشش، مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبت تھی۔ جو اس زمانے میں گاہے گاہے بمبئی قیام کرتے تھے۔ ندوہ میں شبلی کے بعض حریفوں نے انھیں ندوہ سے نکالنے کے لئے ووٹ طلب کئے تھے۔ مولانا اس کا ذکر کر کے ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ان کے ووٹ نہیں آئے۔ ورنہ بمبئی میں آ کر ٹھکانا ملتا۔ اور خوب صحبت رہتی۔

ایک اور خط میں ہے:۔

میں آج بمبئی جا رہا ہوں۔ گو آپ کے بغیر وہ ویرانے سے بدتر ہے۔

دسمبر ۱۹۰۹ء میں ابوالکلام آزاد، شبلی سے کسی بات پر کشیدہ خاطر ہو گئے۔ مولانا انھیں ایک مختصر سے خط میں لکھتے ہیں:۔

میں سمجھتا تھا کہ آپ نے میری نیازمندی کو تسلیم کر لیا ہے لیکن جب طلبی کے آرام

سے ثابت ہوا۔ ع خود غلط بود انچہ۔ یہ بھی بار بار لکھنے کی بات تھی؟

اگلا خط فقط ایک شعر پر مشتمل ہے ؎

دوسہ روزے است کہ دُزدیدہ نگہ وین عجب است
نہ ثواب زمن آمد، نہ گناہے گاہے!

شبلی نے ابوالکلام آزاد کے نام کئی خطوں میں اظہار مدعا فقط ایک شعر یا ایک مصرعے تک محدود رکھا ہے۔ ایک 'خط' ہے ؎

شراب لطف، پُر در جام مے کردی و مے گفتم
کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار اُفتم

ایک اور "خط" فقط ایک مصرعے تک محدود ہے۔ لیکن ملاحظہ کیجئے کہ ادائے مطلب کے اس بادشاہ نے ایک قطرے میں شکایتوں اور آرزوؤں کے کتنے دریا بھر دیئے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

اس قدر ناسیِ اربابِ وفا ہو جانا!

ان دنوں شبلی کے تعلقات اپنے رفقائے کار سے بہت بگڑ گئے تھے اور وہ انھیں ندوہ سے نکالنے کے درپے تھے۔ مولانا کے خلاف جو الزامات لگائے جاتے تھے۔ ان میں ابوالکلام آزاد کی محبت بھی تھی۔ شبلی ان الزامات کی فہرست دے کر ایک خط خود آزاد کو لکھتے ہیں:۔

ہاں انھیں جرائم میں ابوالکلام آزاد کی محبت بھی ہے!

کرنل عبدالمجید خاں کی دستگیری سے مولانا کی علحدگی کی تحریک تو کامیاب نہ ہوئی لیکن ابوالکلام آزاد سے ان کے تعلقات میں اُن کا رشتہ ہموار ہوتا رہا۔ اور انھیں کئی معذرت آمیز خط لکھنے پڑے۔ ۱۸؍اگست ۱۹۱۱ء کا ایک خط ہے:۔

برادرِ عزیز۔
آپ کا لہجہ اگرچہ اب تک نہیں بدلا لیکن بخدا یہ اُمید قائم ہے کہ کلکتہ پہنچوں گا تو آپ سخت دلی سے کام نہ لے سکیں گے اور ظاہری طور سے سہی لیکن وہی قدیم عنائتیں پھر مبذول ہوں گی اور میرے لئے اسی قدر کافی ہے۔ پھر وہ مجاز رفتہ رفتہ حقیقت بن جائے گا۔

ان سب باتوں کے ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں اور ندامت سے منفعل ہوجاتا ہوں کہ جرم سخت ہے بلکہ سخت سے سخت تر لیکن جس سے معاملہ ہے اس کا دل بھی اسی قدر نرم بلکہ نرم تر ہے۔ اس لئے جراَتِ معذرت قائم ہے اور رہے گی۔

ن یہ اُمید پوری نہ ہوئی اور شبلی کو ایک اور معذرت کا خط لکھنا پڑا۔
آپ کا کارڈ پہنچا۔ مجھ کو بڑی شکایت آپ سے تلون مزاجی اور عدمِ استقلال کی تھی۔ بارے اس مرتبہ آپ اپنی ناراضی میں پورے مستقل رہے۔ اور اب تک ہیں ؎

بخت بد بیں کہ بہ شبلی نہ کند غیر جفا نیک خوئے کہ وفا را ز جفا نشناسد

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام شبلی کے خطوط میں فقط ناز و نیاز، گلے شکوے اور معذرت خواہیاں نہیں۔ بعض بڑے پتے کی باتیں اور کارآمد نصیحتیں بھی ہیں۔ آزاد نے ایک زمانہ ندوۃ العلما میں شبلی کی صحبت میں گزارا تھا۔ مذہبی اصلاح اور سیاسی معاملات میں دونوں ہم خیال تھے۔ شبلی کا جن نوجوانوں کی ذہنی تشکیل میں ہاتھ تھا۔ ان میں سب سے ذہین اور اولوالعزم ابوالکلام آزاد تھے۔ اور یہ ظاہر تھا کہ شبلی کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے ان سے زیادہ موزوں کوئی نہیں۔ چنانچہ شبلی نے مسلسل کوشش

کی کہ اس نوجوان کی ذہنی اور علمی تربیت اس طریقے پر کی جائے کہ اسے اپنا کام پورا کرنے میں مشکلات کا سامنا نہ ہو۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کو غزل گوئی کا شوق تھا اور شروع میں وہ کثرت سے کلکتے کے مشاعروں میں غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ شبلی اس کی نسبت، بڑے ادب سے، لیکن بڑی وضاحت کے ساتھ، کلکتہ سے واپس آکر، انھیں لکھتے ہیں:۔

آپ کی سخن سرائی پر بار بار ٹوکنے کو جی چاہتا تھا کہ مرض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس قدر گستاخی نہ ہو سکی۔ بہرحال کچھ دن زبانِ سعدی درکام رہنی چاہیے۔

ایک اور خط میں ہے:۔

آپ کو اب زیادہ مولویت کی صورت میں رہنا چاہیے۔ اس سے اچھے اچھے کام لے سکتے ہیں۔

نکتہ چیں کہیں گے کہ آخری فقرے نے، ابوالکلام آزاد نہیں، تو کم از کم شبلی کی مولویت کی قلعی کھول دی ہے۔ لیکن شبلی نے آزاد کو جو نصیحت کی تھی۔ کیا وہ ان کے فائدے کی نہ تھی؟ اور کیا سید سلیمان کا یہ بیان غلط ہے کہ یہ شبلی کا فیضِ صحبت تھا جس نے ابوالکلام آزاد کو مولوی ابوالکلام آزاد بنا دیا؟

———— ⁂ ————

ندوۃ العلما لکھنؤ

(۲)

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک

بمبئی اور کلکتہ کی دلچسپیاں شبلی کے لئے بلا کی کشش رکھتی تھیں لیکن ندوہ کی کشش اس سے زیادہ تھی۔ شبلی کو اگر عطیہ اور زہرا کی صحبت اور بمبئی اور کلکتہ کے خوشنما مناظر سے تعلقِ خاطر تھا تو اس مجموعۂ اضداد کو اپنی قوم اور مذہب اور اپنے علمی و ادبی مشغلے ان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ وہ بمبئی یا جنجیرہ جاتے تب بھی ان کا معمول تھا کہ اپنے عزیز اور حسین میزبانوں سے اس وقت ملتے جب صبح صبح اپنے "وظیفۂ علمی" سے فارغ ہو جاتے۔ چنانچہ شبلی کی رنگین دلچسپیوں سے اُن کے قومی کاموں میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ ان کی سب سے زیادہ قومی مصروفیت کے یہی دن تھے۔ شبلی کی غیر معمولی احتیاط کی جکڑ بندان دنوں کم ہو رہی تھی اور جس ذوق و شوق سے وہ فارسی غزلوں میں اپنا دل کھول کر رکھ رہے تھے۔ اسی جوش و ولولے سے قومی کاموں میں ہاتھ مار رہے تھے۔

ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۸ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال صوبہ کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لئے پانچ سو روپیے ماہوار کی امداد ملنی شروع ہوئی۔

لیکن اس گراں قدر امداد سے بعض اُلجھنیں بھی پیدا ہوئیں۔ ندوہ کی باقی آمدنی دو سو روپے سے بھی کم تھی اور یہ پانچ سو فقط غیر مذہبی تعلیم کے لئے تھے۔ اس امداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مذہبی تعلیم کا پلہ بھاری ہوگیا اور ندوہ زیادہ تر ایک غیر مذہبی مدرسہ ہوگیا۔ اب مولانا کو اس صورت حالات کی اصلاح کی فکر ہوئی۔ اس وقت بھوپال میں مولانا کے ایک دلی ہی خواہ اور ندوہ کے سچے محسن مولوی محمد امین زبیری حضور بیگم بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے۔ مولانا نے انھیں خط لکھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ندوہ کی مستقل آمدنی ابھی تک صرف دو سو ہے۔ گورنمنٹ نے پانچ سو دئے اسلئے اب خالص مذہبی علوم کا صیغہ اس کے مقابلے میں بہت کم وقعت رہ جاتا ہے۔ ضرور ہے کہ خود ندوہ کی آمدنی میں اضافہ ہو۔

مولوی محمد امین نے یہ صورتِ حالات حضور بیگم صاحبہ کی خدمت میں عرض کی۔ جنھوں نے بھوپال کی سابقہ امداد (پچاس روپے) میں دو سو روپے ماہوار کا اضافہ کردیا۔ اسی طرح رام پور سے بھی پانچ سو روپے سالانہ ملنے شروع ہوئے اور جب سنہ ۱۹۱۱ء میں ہز ہائی نس آغا خاں ندوہ تشریف لائے۔ تو اُنھوں نے بھی پانچ سو روپے سالانہ کی امداد منظور کی۔

ندوہ کے مالی استحکام کے علاوہ شبلی نے اس کی عام شہرت اور مقبولیت پر توجہ کی۔ انھوں نے ندوہ کے ایک بالکل ابتدائی اجلاس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ علما ندوہ کے پلیٹ فارم پر متحد ہوکر قومی معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے تعلیمی مشغلوں کے علاوہ بعض دوسرے کاموں میں بھی ہاتھ ڈالا۔ اور ان معاملات میں ندوہ کو قوم کی آواز بنانا چاہا۔ ان میں سے ایک مفید کام قانونِ وقف علی الاولاد تھا جس کا سلسلہ سب سے پہلے سر سید نے شروع کیا تھا لیکن اس وقت قانون دان اس کے خلاف

تھے۔ اس کے بعد سید امیر علی نے پہلے ہائی کورٹ کلکتہ میں کرسئ عدالت پر بیٹھ کر (۱۸۹۴) اور پھر لندن کے ایک انگریزی رسالے میں اس مسئلہ کے حق میں وہ مضبوط دلائل پیش کیں جنھوں نے قانونی اعتراضات کی ٹھوس رکاوٹ کو بہت حد تک دور کر دیا۔

جس وقت سر سید نے اس مسئلے کو اُٹھانا چاہا۔ اس وقت مولانا علی گڑھ میں تھے اور سر سید کی کوششوں سے بے خبر نہ تھے۔ سید امیر علی کے فیصلے اور مضمون کے بعد اُنھیں جرأت ہوئی کہ اس مسئلے کو نئے سرے سے اُٹھائیں اور حکومت کو آمادہ کریں کہ سید امیر علی کے فیصلے کے مطابق وقف الاولاد کا قانون بنائے۔ اس کے علاوہ مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۰۶ء کے اجلاس کانگریس میں اس مسئلے پر پُرزور تقریر کی۔ اب مولانا شبلی کا راستہ صاف تھا۔ اُنھوں نے ندوہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۰۸ء میں اس کے حق میں ریزولیوشن پاس کرایا اور پھر اس کی تکمیل کے لئے نہایت سرگرم اور باقاعدہ کوششیں شروع کیں۔ اُنھوں نے اس کام کے لئے ندوہ کے زیر حمایت ایک مجلسِ وقف قائم کی اور ملک میں اس کی تائید میں جابجا جلسے کرائے لیکن اس مسئلے کا حل گورنمنٹ نے نہ کیا۔ بلکہ مسٹر محمد علی جناح نے اسے کامیابی کے زینہ تک پہنچانے کے لئے اصل عملی قدم اُٹھایا۔ اس وقت ملک میں منٹو مارلے سکیم کے مطابق لیجسلیٹو کونسل بن چکی تھی جسے وضع قوانین کا تھوڑا بہت اختیار تھا۔ مسٹر جناح اس کونسل کے ممبر تھے۔ اُنھوں نے حکومت سے اس مسئلے پر استفسار کیا اور جب اُنھیں پتہ چلا کہ حکومت اس مسئلے کے حق میں قانون بنانے کو تیار نہیں لیکن اگر کوئی پرائیویٹ ممبر بل پیش کرے گا۔ تو اس پر گورنمنٹ غور کرے گی۔ تو اُنھوں نے خود وقف الاولاد بل کونسل میں پیش کیا جو تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد منظور ہو گیا۔

قانون وقف الاولاد کے نفاذ میں بہت سے مسلمانوں کی کوششوں کو دخل تھا۔ بلکہ جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے اس میں سید امیر علی اور مسٹر محمد علی جناح کا حصہ سب سے زیادہ ہے لیکن عام مسلمانوں میں اس کے حق میں تحریک پیدا کرنے میں یقیناً سب سے زیادہ دخل مولانا شبلی کو تھا اور اس تحریک کی وجہ سے ندوہ قوم کے ان حلقوں کے سامنے بھی آ گیا جنھیں علیمی معاملات کیساتھ خاص دلچسپی نہ تھی۔

اس تحریک کے ساتھ ساتھ مولانا نے ندوہ ہی سے اشاعتِ اسلام کی تحریک کو چلانا چاہا۔ ۱۹۰۸ء میں آریہ سماج کی کوششوں سے راجپوتانہ اور نواح دہلی و آگرہ کے کئی مسلمان راجپوت، جن میں بہت سی ہندوانہ رسوم جاری تھیں۔ دوبارہ ہندو ہونے پر آمادہ ہوئے۔ مسلمانوں میں اس خبر سے بڑا ہیجان پھیل گیا۔ کرنیل عبدالمجید خاں نے، جو خود مسلمان راجپوت تھے۔ مارچ ۱۹۰۸ء میں پٹیالہ میں ایک مسلمان راجپوت کانفرنس منعقد کی اور مولانا کو بھی دعوت دی۔ مولانا اس کانفرنس میں اپنے اور ندوہ کے ایک بڑے محسن کی خوشی کے لئے کسی قدر احساسِ مجبوری کے ساتھ شریک ہوئے لیکن یہی شرکت مسئلہِ اشاعتِ اسلام میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ یہاں سے واپس جا کر انھوں نے "نومسلم راجپوت اور اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں اگرچہ زیادہ زور ایک مذہبی تعلیم کی وسیع الشان درس گاہ (یعنی ندوہ) کی اہمیت اور ضرورت پر تھا لیکن اس میں اشاعتِ اسلام کی ضرورت پر بھی بحث تھی۔ اس کے بعد وہ زیادہ شوق سے اس مسئلے پر متوجہ ہوئے۔ اشاعتِ اسلام کی انجمنیں بنائی گئیں۔ رپورٹیں تیار ہوئیں۔ اپیلیں شائع ہوئیں۔ ندوہ کو اشاعتِ اسلام کا مرکز قرار دیا گیا لیکن ان سب کارروائیوں کا ذرّہ بھر نتیجہ نہ نکلا۔

اس کی پہلی وجہ تو ندوہ کے اراکین کا اختلاف تھا۔ پھر مولانا کی اپنی حالت "یک سر و ہزار سودا" والی ہورہی تھی اور ان کی صحت اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ ندوہ اور تصنیفی کاموں کے علاوہ کوئی تیسرا اہم کام ہاتھ میں لیں۔ اس کے علاوہ جب وہ سیاسیات میں کود پڑے اور کانگریس اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی بن کر سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے تو شاید سیاسی مصلحتیں بھی اس کے خلاف تھیں[1] کہ وہ ایک ایسی تحریک کی قیادت کریں جس سے ہندو مسلم تعلقات کا بگڑنا ناگزیر تھا چنانچہ ان کا سارا جوش

---

[1] سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مذہبی معاملات میں جو تلخ گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ ان کا نمونہ شبلی کے رفیق کار مولانا ابوالکلام آزاد نے بالکل اسی زمانے میں دیا۔ جس طرح بعض مسلمان راجپوتوں میں ہندوؤں کی بہت سی باتیں ہیں۔ اسی طرح پنجاب میں مشہور باطنی داعی شمس الدین ملتانی کے وقت سے کئی لوگ ایسے ہیں۔ جو بظاہر ہندو اور بہ باطن اسماعیلی ہیں۔ ۱۲-۱۹۱۰ء میں جب آریہ سماج نے نیم مسلم راجپوتوں کو ہندو بنانے کوشش کی۔ تو ساتھ ساتھ انھوں نے ان اسماعیلیوں میں بھی اپنا پرچار شروع کردیا۔ اس پر ہز ہائی نس آغا خاں نے انھیں حکم دیا کہ وہ اسماعیلی مسلمان ہونے کا اعلان کردیں۔ اس پر فریقین میں جو کشمکش شروع ہوئی۔ اس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مشہور اخبار الہلال میں لکھتے ہیں:۔

> لیکن ہم اپنے ہندو آریا معاصرین کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اس تحریک کو مفید سمجھتے ہیں۔ تو شوق سے جاری رکھیں۔ اگر تمام اسماعیلی ہندو، ہندو مذہب اختیار کرلیں۔ جب بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں.....
> مسلمانوں کی بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ تعداد کی قلت و کثرت کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

گھٹ کر رہ گیا۔ مسئلہ اشاعتِ اسلام میں انھیں جس طرح کامیابی ہوئی۔ اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے۔ جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلما کے سالانہ اجلاس میں کی۔ فرماتے ہیں :۔

"دو سال ہوئے کہ شاہجہاں پور سے ایک خط میرے پاس سفید خان سوداگر کا آیا کہ شاہجہاں پور سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں ہے جمال پور۔ وہاں کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں۔ وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں۔ آریہ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ ان کو ہندو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ جلد آئیے اور مدد کیجیے۔ انھوں نے اس کے ساتھ ہی دہلی کی انجمن ہدایت الاسلام کے مولانا عبدالحق حقانی کو لکھا تھا۔ وہ وہاں سے تشریف لائے تھے اور میں ندوہ سے گیا جس وقت میں یہاں سے چلا ہوں۔ میری جو حالت تھی یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے کہ میں نے اس وقت کوئی گالی نہیں اٹھا رکھی تھی۔ جو میں نے ان ندوہ والوں کو نہ سنائی ہوگی کہ اے بے حیاؤ اور اے کم بختو! ڈوب مرو۔ یہ واقعات پیش آئے ہیں۔ ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڑھ کو

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

چکر میں پڑ گئے ہیں۔ تعداد کو قوی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دلوں کو قوی نہیں کرتے۔ حالانکہ اسلام کی نظر میں تعداد کوئی چیز نہیں ......

جو جاتے ہیں۔ ان کو جانے دو۔ وہ پہلے ہی کون سے مسلمان تھے کہ اب ان کے ہندو ہو جانے کا ماتم ہو ......"

شبلی نے ہندو مسلم اتحاد کی خواہش میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف میزانِ عدل کے ایک پلے کو جس طرح جھکا دیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

بھی پھونک دو! یہی الفاظ میں نے اُس وقت کہے تھے اور آج بھی کہتا ہوں۔ اس وقت نہایت افسوس میں مَیں یہاں سے گیا تھا۔ وہاں جاکر میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے۔ لوگوں نے یہ بیان کیا کہ آریہ اس گاؤں میں آئے ہوئے ہیں اور وہ گاؤں کے نومسلم راجپوتوں کو ہندو بنانا چاہتے مسلمان علماء کو بُلایا ہے۔ جمال پور سے ایک کوس پر خیمہ کھڑا کیا گیا ہے۔ تین سو روپے کھانے میں صرف ہوئے ہیں۔ چندہ وغیرہ کیا گیا ہے۔ وہ نومسلم بیچارے یہ کہتے تھے کہ مناظرہ ہم جانتے نہیں۔ پڑھے لکھے نہیں۔ آپ ہمارے گاؤں میں آیئے اور یہاں آکر ہم کو سمجھایئے۔ جو باتیں ہمارے دل میں ہوں گی ہم آپ سے کہیں گے۔ آپ ان کا جواب دیجئے۔ پھر جو کچھ بھی ہو۔ یہ واقعہ ہے۔ اس میں ذرا بھی غلط نہیں کہتا ہوں۔ اس کے شاہد وزیر حسن صاحب وکیل شاہجہاں پور ہیں۔ وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔ اس پر ایک شخص بھی راضی نہ ہوا کہ گاؤں میں جائے۔ اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ لوگ خدانخواستہ فوجداری کریں گے یا ماریں گے۔ کیونکہ پولیس اور تحصیلدار وہاں موجود تھے کہ امن و امان قائم رہے۔ مَیں نے بالآخر یہ کہا کہ بھائیو مجھے تو پالکی میں ڈال کر وہاں لے چلو۔ مَیں چلتا ہوں لیکن کوئی شخص نہیں لے گیا۔

غرض تین دن تک مَیں وہاں پڑا رہا۔ بالآخر ان لوگوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں۔"

ان کاموں اور اسکیموں کے ساتھ مولانا کے تصنیفی مشغلے برابر جاری تھے۔ متفرق مضامین اور بمبئی کی غزلیات کے علاوہ اس زمانے کی مستقل تصنیف شعر العجم ہے۔ جو ۱۹۰۶ء میں شروع ہوئی۔ اور ۱۹۰۹ء میں

پایۂ اختتام کو پہنچی۔ شعرالعجم کی مختلف جلدیں مختلف زمانوں میں شائع ہوئیں۔ حتےٰ کہ آخری جلد مولانا کی وفات کے بعد پریس سے آئی۔ لیکن ۱۹۱۰ء تک پہلے تین حصے چھپ چکے تھے اور پنجاب یونیورسٹی نے اسے سال کی بہترین تصنیف قرار دے کر مؤلف کو پندرہ سو روپے کا انعام دیا۔

حال میں تنقیدِ شعرالعجم کے نام سے علامہ حافظ محمود خاں شیرانی کے وہ مضامین، بہ اضافہ و تصحیح شائع ہوئے ہیں۔ جو پہلے انجمن ترقی اُردو کے رسالہ اُردو میں شائع ہوئے تھے۔ علامہ شیرانی، شاید دورِ حاضر میں اردو اور فارسی ادبیات کے سب سے زیادہ ٹھوس اور جیّد عالم ہیں۔ اور ان کے مضامین پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ قدیم علما میں کیسے کیسے گوہر ہائے شب چراغ موجود ہیں۔ جن علوم سے انھیں ربط ہے ان کے مطابق ان کی معلومات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ نگاہ ان کی بڑی تیز ہے۔ تلاشِ واقعات میں تساہل، یا خیالات میں جھول، ان کے نزدیک ایسے جرائم ہیں۔ جن کا کوئی کفارہ نہیں۔ قدرتی بات ہے کہ جن چیزوں کو عام علما اپنی دسترس سے بہت بالا سمجھتے ہیں۔ وہ بھی علامہ شیرانی کے بلند معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ چند سال ہوئے۔ ناگپور کے شمس العلما پروفیسر عبدالغنی نے مغلوں سے پہلے کی فارسی ادبیات پر ایک ضخیم کتاب شائع کی تھی۔ اس پر علامہ شیرانی نے رسالہ اردو میں کوئی سو صفحے کا ریویو بھی لکھا۔ کوئی بھی انصاف پسند یہ ریویو پڑھ کر یہ نہیں کہے گا کہ علامہ کا ریویو اصل کتاب سے دہ چند قدر و قیمت کا نہیں۔ کہاں پروفیسر عبدالغنی کی عامیانہ معلومات، جو فقط چند مشہور اور مطبوعہ کتابوں کا خلاصہ تھیں۔ اور کہاں علامہ شیرانی کا ذخیرۂ علمی، جن کی نظر سے ملک کی کسی لائبریری کی کوئی قلمی کتاب نہیں چھپی۔ اور جن کا ذاتی کتب خانہ،

حجم میں نہ سہی، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے، ایک دو لائبریریوں کو چھوڑ کر ملک کے سب سے مشہور کتب خانوں کے بالمقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس پر نقطۂ نظر اور نگۂ تنقید کا فرق۔ کہاں پروفیسر عبدالغنی، جو ہر لکھے ہوئے حرف کو، بغیر کسی شک اور سوال کے قبول کر لیں اور کہاں شیرانی، جو ایک ایک حرف کو، ایک ایک فقرے کو اس طرح جانچیں جس طرح ایک ماہرِ فن مقنّن ایک دستاویز کی عبارت کو دیکھتا ہے۔ علامہ شیرانی نے بلا مبالغہ پروفیسر عبدالغنی کی کتاب کو تہس نہس کر دیا ہے۔ اُنھوں نے جو ضرب لگائی ہے۔ ہتھوڑے کی ضرب ہے۔ برمحل۔ قاطع۔ مسکت۔ دندان شکن اور پروفیسر صاحب کو ضرور افسوس ہوگا کہ اُنھوں نے ایک ایسی عامیانہ کتاب لکھ کر ان ماہرانِ فن کو کیوں اُکسایا۔ جو کچّی اور ادھوری کوششوں کو علم و فن کے خلاف ایک جُرم سمجھتے ہیں۔

یہی عمل علامہ شیرانی نے آج سے چند سال پہلے علی گڑھ کے پروفیسر محمد حبیب کی مرتّب کردہ خزائن الفتوح کے ساتھ کیا تھا اور دکھا دیا تھا کہ خواہ ہمارے روشن خیال پروفیسر کیسی ہی شیریں اور بامحاورہ انگریزی لکھ لیں۔ اور خواہ ان کی ذاتی خوش اخلاقی اور خوش معاشی کا کیا عالم ہو، لیکن جہاں تک علم و فن کی کٹھن منزلوں کا تعلق ہے۔ صحتِ بیان۔ معلومات فنی پختگی اور لفظی احتیاط میں وہ ہمارے قدیم اساتذۂ فن سے بہت پیچھے ہیں!

شیرانی نے شعر العجم پر جو تنقید کی ہے۔ وہ بھی اسی طرز اور پائے کی ہے۔ علامہ شبلی بھی ایک پختہ کار عالم تھے لیکن اُنھوں نے کام کا آغاز کیا تھا اور ظاہر ہے۔ وہ اسے انتہا تک نہ پہنچا سکے۔ انھیں وہ سہولتیں میسّر نہ تھیں۔ جو بعد کے علما کو حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ادیب اور

شاعر پہلے تھے۔ نقاد اور مورخ بعد میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی کتاب میں کئی ایسی چیزیں رہ گئی ہیں۔ جو ان نگاہوں میں کھٹکتی ہیں۔ جنھیں طرز ادا کی شستگی سے پہلے صحتِ بیان کی تلاش ہوتی ہے۔ شبلی پر شیرانی کے اکثر اعتراضات بجا ہیں لیکن انھوں نے ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ شبلی کا مقصد ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاق پیدا کرنا یا برقرار رکھنا تھا۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے کئی جگہ دولت شاہ سمرقندی اور دوسرے دلچسپ مگر غیر محتاط راویوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا ہے اور واقعات کا بیان کرتے ہوئے، ان پر کئی جگہ تیز نگہِ تنقید نہیں ڈالی لیکن جیسا کہ علامہ شیرانی نے خود اعتراف کیا ہے "فارسی نظم کی تاریخ و تنقید پر فارسی اور اردو میں اب تک جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ شعر العجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے۔" فارسی شاعری کی تاریخ میں اس کتاب کا وہی مرتبہ ہے۔ جو اردو شاعری کی تاریخ میں آبِ حیات کا۔ اور اس کتاب نے ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاق بڑی حد تک دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

اپنی تصانیف کی نسبت ایک جگہ شبلی نے لکھا تھا کہ انھیں ان میں الفاروق سب سے زیادہ عزیز تھی اور فی الواقع اس کتاب کا مرتبہ ہمارے ادب میں بہت بلند ہے۔ شبلی کی تصانیف میں سب سے زیادہ قبولیتِ عامہ اسی کو نصیب ہوئی ہے لیکن شاید اس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ اس کی مقبولیت کا سبب فقط کتاب کی ادبی اور فنی خوبیاں نہیں۔ بلکہ جن ولولہ انگیز واقعات کا اس میں بیان ہے۔ انھوں نے کتاب کو، بالخصوص اس کے نصفِ اوّل کو مسلمانوں کے لئے ایک ضیافت دل و دماغ بنا دیا ہے۔ عہدِ فاروقی کے

واقعات اور ایران و روما کی قدیم اور پُرشکوہ بادشاہتوں کے خلاف مسلمانوں کی پیہم فتوحات، ایک اہلِ قلم کو ایسا مضمون بہم پہنچاتی ہیں۔ جسے سرسبز کرنا مشکل نہیں۔ ہمارے ادب میں اور کئی اہلِ قلم نے ان واقعات کو بیان کیا ہے (اور اگرچہ شبلی کا انداز تحریر کسی میں نہیں) لیکن یہ واقعات ہی ایسے ہیں کہ اگر انھیں راشد الخیری کی ماہِ عجم میں، بلکہ منشی غلام قادر فصیح کی تاریخِ اسلام میں بھی پڑھیں۔ تو طبیعت کو ایک خاص فرحت محسوس ہوتی ہے الفاروق کی مقبولیت میں اس کے موضوع کو بھی بڑا دخل ہے۔ اور ہمارے خیال میں شبلی کی تصانیف میں شعر العجم کا مرتبہ بھی الفاروق سے کم نہیں۔ بلاشبہ موضوع یہاں بھی خوشگوار ہے۔ (اور جیسا کہ مولانا شروانی نے ایک جگہ لکھا شبلی کی کامیاب انشاپردازی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ تر زرخیز زمینوں میں تخم ریزی کرتے تھے) لیکن پھر بھی ریسرچ اور تنقید کی ایک کتاب کو، ایک کڑے علمی معیار سے بہت نیچے آئے بغیر، شگفتہ اور دلچسپ بنا دینا فقط ایک کامل انشاپرداز کا کارنامہ ہے!

جن دنوں شبلی شعر العجم لکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کا دل و دماغ چمن زارِ بمبئی کی ہواؤں سے معطر رہتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقط دستۂ گل میں ہی نہیں۔ بلکہ شعر العجم میں بھی "خمارِ چشمِ ساقی" ملا ہوا ہے اور یہ فقط ان دو لوں کی تخصیص نہیں۔ بلکہ اس دوران میں شبلی نے جو کچھ بھی لکھا اس سے ایک خاص طرز کی نفاست، حسنِ بیان اور شائستگی ٹپکتی ہے۔ شبلی کے مضامین عالمگیر مناظرانہ قسم کے تاریخی مضامین ہیں۔ فقط تصویر کا ایک رُخ نمایاں کرتے ہیں اور خالص تاریخی نقطۂ نظر سے ان پر کئی بجا اعتراض ہو سکتے ہیں لیکن انھیں پڑھیے۔ ان کے طرز تحریر پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ ایک کامل الفن

اُستاد کے ہاتھ میں ریسرچ اور تحقیق کے سنگریزے کس طرح شگفتہ پھول بن جاتے ہیں!!

شعرالعجم کے علاوہ شبلی کی اس زمانے کی ایک دلچسپ تالیف الانتقاد ہے۔ جس میں انھوں نے عربی زبان میں جرجی زیدان کی تمدنِ اسلامی کی تاریخ کا رد لکھا ہے۔ جرجی زیدان اس زمانے کا ایک مشہور ادیب اور مورخ تھا۔ اس نے پانچ جلدوں میں ایک ضخیم تاریخ تمدنِ اسلامی لکھی تھی جس میں مختلف مباحث سے تفصیلی طور پر بحث کی تھی اور ایک باب میں مولانا شبلی کے کتب خانۂ اسکندریہ والے مشہور مضمون کی بھی تردید کی تھی۔ جرجی زیدان سے مولانا کے تعلقات تھے۔ ان کے اپنے مضامین اس کے رسالہ الہلال میں شائع ہو چکے تھے لیکن اس نے اپنی تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کئی باتیں ایسی لکھی تھیں۔ جو مولانا کی حمیتِ قومی ناگوار تھیں مصر کے کئی علما کو بھی ان باتوں کے جواب کا خیال آیا لیکن کسی کو تکمیل کار کی توفیق نہ ہوئی۔ مولانا نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور بڑی محنت اور انہماک سے ۱۹۱۱ء کی برسات میں ختم کیا۔ ان دنوں رمضان کا مہینہ تھا۔ برسات کی امس اور حبس اس پر مستزاد۔ مولانا اسی حالت میں کتابیں دیکھنے اور حوالے ڈھونڈتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور بینائی میں ضعف آگیا۔ لیکن اسلام کے اس شیدائی نے اپنا کام ختم کر کے چھوڑا۔ نومبر ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں:۔

> تمدن کے رد میں ابتداً ایک ہفتہ میں اس قدر انہماک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اترتا محسوس ہوا۔ اور اب اس سے حرف نظر نہیں آتے۔ ایک آنکھ جو صحیح ہے اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے۔ اب لکھنا پڑھنا بالکل کم ہو گیا ہے

جرجی زیدان کی کتاب کا رد لکھنے کے بعد مولانا اپنی زندگی کی تصنیفی مہم پر متوجہ ہوئے۔ رسولِ اکرمؐ کی سوانح حیات انھوں نے سنہ میں لکھنی شروع کی تھی لیکن وہ اپنی تصنیف پر مطمئن نہ ہوئے۔ اور کتاب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی۔ اس کے بعد جب وہ ۱۹۰۶ء میں بڑودہ گئے تو مولانا محمد علی نے ان سے مارگولیتھ کی کتاب کا رد لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جس نے کتب احادیث سے رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے متعلق بڑے معاندانہ اور زہرناک نتائج استنباط کئے تھے۔ اور ۱۹۰۵ء میں آنحضرتؐ کی ایک نہایت مخالفانہ سوانح حیات لکھی تھی۔ مولانا اس وقت شعر العجم کی تالیف میں مصروف تھے۔ اس لئے معاملہ التوا میں پڑ گیا جب وہ اس سے فارغ ہوئے اور بعض دوسرے واقعات کی بنا پر بھی انھیں کتاب کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی تو انھوں نے ۱۹۱۲ء کے آغاز میں سیرت نبوی لکھنے کا مصمم ارادہ کیا اور جنوری ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں اس کا اعلان کر دیا۔ مولانا کا ارادہ ایک نہایت مفصل کتاب لکھنے کا تھا جس میں رسول اکرمؐ کی زندگی کے متعلق تمام مواد نگہِ تنقید سے پرکھا جائے اور مغربی نکتہ چینوں کے تمام اعتراضات کا جواب ہو۔ اس کے لئے بہت سی نایاب اور قلمی کتابیں درکار تھیں۔ مغربی مصنفین کی کتابوں کا ترجمہ بھی ضروری تھا۔ چنانچہ مولانا نے اس کام کے ماہانہ مصارف کے لئے ڈھائی سو روپے ماہوار اور خرید کتب کے لئے کچھ نقد روپے کی درخواست کی۔ مولانا کا ارادہ ایک مجلس تالیف سیرت قائم کرنے کا تھا جس کے ارکان روپے سے یا دوسرے طریقوں سے مدد کریں لیکن اس کی ضرورت پیدا نہ ہوئی۔ مولوی محمد امین زبیری نے، جنھوں نے اس سے پہلے بھی ندوہ کی بڑی

سناد کے ہاتھ میں مولانا کی اپیل حضور بیگم صاحبہ بھوپال کے کانوں تک پہنچائی جاتے ہو ... بھوپال سے اپریل ۱۹۱۲ء میں دو برس کے لئے دوسو روپے ہوار منظور ہوئے ۔ (جو غالباً اب تک جاری ہیں) اس کے علاوہ کتابوں کی خریداری کے لئے نواب زادہ حمید اللہ خاں (موجودہ فرمانروائے بھوپال) نے دو ہزار روپے منظور فرمائے ۔

رسولِ اکرمؐ کے شیدائیوں نے مولانا کی جھولی بھر دی اور انھیں اقتصادی الجھنوں سے بالکل آزاد کر دیا ۔ چنانچہ سیرت کا کام شروع ہوا ۔ لیکن اس کی تکمیل میں بہت دیر لگی اور اس کی کئی وجوہات تھیں ۔ ایک سبب تو یہ تھا کہ جس پیمانے پر مولانا یہ کام کرنا چاہتے تھے ۔ اس کا اور مولانا کی کمزور صحت کا تقاضا تھا کہ وہ اس کام کے علاوہ باقی سب کاموں سے علیحدہ ہو جائیں ۔ یہ مولانا سے ہوتا نہ تھا ۔ جس وقت انھوں نے سیرت نبوی کے لئے اپیل شائع کی ۔ ٹھیک اسی وقت وہ "ندوہ کی بساط پر آخری بازی" لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے ۔ اس کے علاوہ اب انھوں نے سیاسیات کے میدان میں بھی قدم بڑھایا اور جو وقت سیرت پر صرف ہونا تھا ۔ اس کا کافی حصہ پولیٹکل نظموں اور مضامین کی نذر ہوا ۔ اس کے علاوہ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے ۔ انھیں کام کی مشکلات زیادہ نظر آنے لگیں ۔ شروع میں جب وہ مغربی مصنفین کی کتابوں کے ترجمے سنتے تو وہ ان کے نتائج اور قیاسات پر ایک احساسِ برتری سے مسکرا دیتے لیکن جب انھوں نے زیادہ تحقیق شروع کی ۔ تو انھوں نے دیکھا کہ یورپ کی ان توپوں اور مشین گنوں کے لئے گولہ بارود تو مسلمان مصنفین نے خود مہیا کیا ہے !

نومبر ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے۔ ان کے ایک ایک حرف کے لئے سیکڑوں اوراق الٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کمبخت لکھتے تو جھوٹ ہیں۔ لیکن یہ پتہ نہیں لکھتے۔ یہاں خود ہمارے سیرت نگاروں نے بہت بے احتیاطیاں کیں۔

جن دنوں مولانا سیرت نبوی کی تالیف کی تیاری کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان سے بہت دور، بعض ایسے واقعات پیش آئے۔ جنھوں نے مولانا کو بے چین و بے قرار کر دیا اور اسلامی ہندوستان کی سیاسیات کا بھی ایک عرصے کے لئے رخ بدل دیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر، اور ۱۹۱۲ء میں بلقان کی عیسائی ریاستوں نے خود ترکی پر حملہ کر دیا۔ ترکی سے عام طور پر برطانوی حکومت کے تعلقات دوستانہ رہے ہیں۔ برطانیہ کو ایشیا میں روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ رہتا تھا اس لئے وہ مغربی ایشیا میں روس کے قدیمی حریف ترکی کی مدد کرتی۔ اسی مقصد کے لئے برطانیہ نے روس کے خلاف جنگ کریمیا میں حصہ لیا اور عام طور پر ترکوں کی حمایت کی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر انیسویں صدی میں ترکی کو برطانیہ کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ وہ کب کا روس کے پنجۂ آز کا شکار ہو جاتا۔ لیکن لبرل پارٹی کے سرگروہ مسٹر گلیڈ اسٹون ایک متعصب عیسائی تھے۔ وہ اور انکی پارٹی ترکی کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ جب بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کو جرمنی کی طرف سے ایک خطرۂ عظیم پیدا ہو گیا۔ تو وزیر خارجہ، سر ایڈورڈ گرے نے اس خطرے کے سدباب کیلئے، نہ صرف فرانس، بلکہ روس سے بھی سمجھوتہ کر لیا اور ان کو مصر۔ ایران۔ افغانستان تبت کی نسبت ایسے معاہدے ہو گئے۔ جن کے بعد برطانیہ ترکی کی مدد سے کنارہ کش ہوا اور روس کا راستہ صاف ہو گیا۔ چنانچہ روس کی شہ پا کر بلقانی حکومتوں نے

ترکی پر حملے کئے اور ایک زمانے میں ترکی کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔

ان واقعات نے اسلامی ہندوستان میں بڑا جوش پیدا کر دیا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زمانے میں تو عثمانی ترکوں کی خلافت کبھی تسلیم نہیں ہوئی لیکن برطانوی حکومت کے دوران میں ترکی سے اسلامی ہندوستان کے روابط بڑھ گئے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں غدر برپا ہوا۔ تو برطانوی حکومت کے ایما پر سلطان روم نے ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں کی حمایت کا پیغام بھیجا۔ اس کے بعد جب ۱۸۷۷ء میں جنگ روس و روم شروع ہوئی تو ہندوستان میں انگریزی افسروں نے ترکی کے لئے چندے جمع کرنے کی حمایت کی اور ہندوستان میں ایک عام جوش پیدا ہو گیا۔ سلطان عبدالحمید کی تحریک "اتحادِ اسلامی" نے ترکی اور ہندوستان کے تعلقات کو اور مضبوط کر دیا۔ اس کے علاوہ ترکی اس زمانے کی سب سے بڑی اسلامی حکومت تھی اور آج کی نسبت اس کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس کی مشکلات نے اسلامی ہندوستان کو بڑا متاثر کیا۔ مولانا شبلی کو ترکوں سے شروع سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان پر ترکی کے مصائب دیکھ کر اور عالم اسلام پر آنے والے مصائب کا خیال کر کے جو اثر ہوا۔ اس کا اظہار انھوں نے نومبر ۱۹۱۲ء میں ایک بڑی پُردرد نظم میں کیا۔ جو اُردو زبان کے سیاسی ادب میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے ؎

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے جب فلک نے کر دیے پُرزے
فضائے آسمانی میں اُڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا فارس گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

اور پھر آگے چل کر خیال ظاہر کیا کہ یہ لڑائیاں ملکی یا سیاسی نہیں۔ مذہبی ہیں اور صلیبی جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلادِ مغرب سے خطاب ہے ؎

کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی — دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں — مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

پھر مسلمانوں سے کہا ہے کہ اگر ترکی مٹ گیا۔ تو اسلام مٹ جائے گا ؎

زوالِ دولتِ عثمان زوالِ شرع و ملت ہے — عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں — نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے یہ تیاریاں کب تک؟

مولانا محمد علی کی کوششوں سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی مشن بلقان بھیجا گیا جس کے ممبر تمام تر علی گڑھ کالج کے زیرِ تعلیم طلبا تھے۔ جب ڈاکٹر انصاری اس سفر کے لئے لکھنؤ سے گزرے۔ تو علامہ شبلی بھی پلیٹ فارم پر الوداع کے لئے موجود تھے۔ گاڑی روانہ ہونے لگی۔ تو انہوں نے فرطِ جوش میں چاہا کہ ڈاکٹر انصاری کے پاؤں کا بوسہ لیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس وقت بوٹ پہن رکھے تھے۔ علامہ ان ہی سے لپٹ گئے۔ لب سے بوٹوں کے بوسے لئے[۱]۔ آنسوؤں سے ان کے گرد و غبار کو دھویا اور اس طرح اس مجسمہ جوش و جذبات نے اپنے سوزِ دروں کو ٹھنڈا کیا۔

جب ڈاکٹر انصاری کا وفد واپس آیا۔ تو مولانا بمبئی میں تھے۔ اس وقت وہاں خیر مقدم کا جو جلسہ ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے ایک نظم پڑھی ؎

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری — کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

---

[۱] ملاحظہ ہو حیات شبلی ص ۵۹۵

اس وقت نئی نسل میں ندوے کی شہرت نصف النہار پر تھی۔ اُردو شعر
پانچ عناصر خمسہ" میں سے تین ختم ہو چکے تھے اور ایک خاموش تھا۔ صرف
مولانا شبلی ہی ایسے تھے۔ جن کا قلم اس وقت حرکت میں تھا اور وہ اس قلم
سے ندوے کی شہرت اور اہمیت بڑھا رہے تھے۔ ندوہ کے سالانہ جلسے
بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ قانون وقف علی الاولاد کے نفاذ میں اگرچہ
اصل ٹھوس کام جسٹس امیر علی اور مسٹر محمد علی جناح نے کیا تھا۔ لیکن جو لوگ
فقط ارباب ندوہ کی تحریریں یا اُردو کے وہ اخبارات پڑھتے، جن کا منبع علم
یہی تحریریں تھیں۔ تو وہ سمجھتے کہ سارا فیض ندوے کا ہے۔ اسی طرح اگرچہ
اشاعتِ اسلام کے معاملے میں ندوہ کو ذرّہ بھر عملی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔
لیکن بہرکیف سکیمیں تو بڑی بڑی تھیں۔ اب نئی نسل کی جو دیوبند سے ناواقف
تھی اور علی گڑھ سے بدظن کی جا رہی تھی۔ ندوہ کی طرف آنکھیں اٹھتیں۔
اور مولانا عام جلسوں میں کہنے لگے "کہ اگر اس وقت کوئی چیز مرجع ہو سکتی
ہے۔ جو سنٹر قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ ندوہ ہے[1]" اور دیوبند وغیرہ کے
ہوتے ہوئے الندوہ کے صفحات میں دعوے کرنے لگے، کہ ندوۃ العلما،

"تمام ہندوستان میں سب سے بڑی مقتدر مذہبی جماعت ہے[2]"

اس زمانے میں ندوہ کا ڈنکا چاروں طرف بج رہا تھا۔ لیکن ندوہ کے
حریف دیوبند کا رسالہ القاسم بار بار لکھتا تھا کہ "آواز دہل از دور خوش است"
والا معاملہ ہے اور فی الواقع اگر مولانا کے اپنے خطوط غور سے پڑھیں۔ تو
خیال ہوتا ہے کہ یہ طعن حقیقت پر مبنی تھا۔ ندوہ کی مالی خوش انتظامیوں

---

[1] خطباتِ شبلی ص ۱۴۲ [2] خطباتِ شبلی جلد ہشتم ص ۲۰

کا جو حال تھا۔ اس کی نسبت مولانا شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

ندوہ کی حالت نہایت ابتر ہے۔ شاہ جہاں پور کی جائداد پر عدالت قبضہ دلا چکی لیکن ہمارے ہاں کوئی خبر نہیں ہوتا۔ جب دو چار خط معتمد مال کو میں اور مولوی عبدالحی صاحب لکھتے ہیں تو اک ذرا چونک کر پھر رہ جاتے ہیں۔ وہ اولاً تو کام کے عادی نہیں۔ اگر ہوں تو ان کو اپنا کام کیا کم ہے۔

للت پور میں ایک شخص نے دو سال ہوئے مکان وقف کیا تھا اب اس کا خط آیا کہ کوئی خبر نہیں لیتا۔ میں کیا کروں۔ یہی اور بہت سے مالی معاملات کا حال ہے۔

علمی حالت اس سے بہتر نہ تھی۔ شبلی جون ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں کہتے ہیں :۔

بہرحال دارالعلوم سے اب ہاتھ دھونا چاہیے۔ جب تک کوئی ماہر فن نہیں آئے گا۔ علمی مذاق نہیں پیدا ہو سکتا۔

بورڈنگ ہاؤس کا حال اس سے بدتر تھا جب محکمۂ تعلیم کے افسر معائنہ کے لئے آنا چاہتے۔ تو شبلی انھیں اس خیال سے ٹال دیتے کہ ندوہ اور بورڈنگ کی اس حالت میں انھیں بلا کر کیا دکھائیں اور جب بالآخر شبلی کے انتساب کے آخری ایام میں وہ آئے۔ تو انھوں نے بورڈنگ ہاؤس کی نسبت لکھا۔ کہ یہ ایک خرگوش خانہ سے بہتر نہیں۔ اور "چھ صفحوں کی سخت رپورٹ" میں صاف کہہ دیا کہ اگر یہ حالت رہی تو سرکاری گرانٹ بند ہو جائے گی[1]

لیکن ندوہ کی سب سے دکھتی رگ طلبا اور اساتذہ کی مذہبی حالت

---

[1] مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۴۳

تھی۔ جو لوگ ندوہ کا اندازہ فقط الندوہ کے مضامین اور سالانہ جلسوں کی دھواں دھار تقریروں سے کرتے۔ ان کے نزدیک تو ندوہ اسلامی ہندوستان کا سب سے بڑا مذہبی مرکز تھا لیکن ندوہ کی چار دیواری میں مذہب کا جو حال تھا۔ اس کا بیان علامہ شبلی کی اپنی زبان سے سنئے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طلبا میں تقدس کا اثر نہیں ہے۔ آپ نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک دفعہ ندوہ کے لڑکے ڈیپوٹیشن کے طور پر بھیکن پور بھی گئے تھے۔ ان کی وضع سے آپ نے سمجھا کہ علی گڑھ کے لڑکے ہیں۔ یہ میری موجودگی سے قبل کا زمانہ ہے۔ اس کی وجہ۔ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتدا سے آج تک کوئی پرنسپل مقدس اور باا ثر نہیں ملا۔

ایک زمانہ میں مولوی فاروق صاحب مرحوم تھے۔ وہ خود بے پروا تھے۔ مولوی..... صاحب خود پابند تھے لیکن اثر کچھ نہ تھا۔ خود ان کا لڑکا مولوی..... ڈاڑھی ترشواتا تھا اور وہ کچھ نہ کہتے تھے۔ اس کی نماز فجر نہ پڑھنے کی میں نے ان سے شکایت کی تو فرمایا کہ "رات کو مطالعہ زیادہ دیکھتا ہے۔ اس لئے صبح کو سوجاتا ہے"۔

اراکین کا شدید باہمی نفاق اس پر مستزاد تھا۔ شبلی اپنے رفقا پر سخت الزام لگاتے تھے اور وہ ان کے خلاف۔ شبلی کہتے ہیں:۔

میں اس کو قطعاً ثابت کرسکتا ہوں کہ فلاں صاحب صبح کی نماز نہیں پڑھتے فلاں صاحب نے اپنی غفلت سے اس وقت تک ہزاروں روپیہ لوگوں کا ضائع کر دیا ہے۔ یعنی لوگوں نے کمرہ کی تعمیر کے لئے دیا تھا۔ وہ تعلیم پر صرف کر دیا۔ وعلی ہذا۔ فلاں صاحب نے وقف کر کے اپنی جائداد دارالعلوم

کو نذ دی اور اب تک رکنِ ندوہ ہیں۔ مکان دارالعلوم کا روپیہ ندوہ ادا کرچکا باوجود اس کے دستاویز واپس نہیں کرتے اور اسی وجہ سے باوجود اس کے کہ دو دفعہ جلسۂ انتظامیہ میں منظور ہو چکا کہ مکان موجودہ فروخت کر ڈالا جائے۔ وہ فروخت نہیں کرتے۔

لیکن شبلی کی اپنی فردِ جرم اس سے کہیں زیادہ تاریک تھی۔ مولانا ایک پُر درد خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں:۔

"فردِ جرم بہت بڑی ہے۔ خورد برد کا بھی الزام ہے۔ بہاول پور کے عطیہ کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے۔ گورنمنٹ سے ایڈ کے متعلق خط و کتابت اکبر الجرائم قرار دی گئی ہے اور سب پر مستزاد الحاد اور زندقہ جن عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامات الاولیاء حق۔ حالانکہ میں تو کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں۔ ہاں انھیں جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔"

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شبلی کا اراکین سے اختلاف نصاب اور انگریزی کے مسئلے پر تھا۔ لیکن یہ اختلاف انھیں ندوہ آنے سے پہلے تھا اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی مدد سے دور ہو چکا تھا۔ مولانا کی تمام تعلیمی اصلاحیں کوئی پانچ برس سے ندوہ میں جاری تھیں اور ان کے اُس زمانے کے بڑے مخالف تو خود اصلاحِ نصاب میں ان کے حامی و ہم خیال تھے۔ مولانا شبلی نے ندوہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء میں کہا:۔

ہمارے مولانا خلیل الرحمٰن صاحب جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک متقشف زاہد ہیں۔ مگر جس وقت انگریزی داخل کرنے کا مسئلہ در پیش ہوا تو آپ بھی

تشریف رکھتے تھے۔ اگر میرا حافظہ غلط نہیں ہوا ہے (۵۵ برس کی عمر کا حصہ ہے) تو مجھے یاد ہے کہ آپ نے کاملاً اس سے اتفاق کیا تھا اور کہا تھا کہ بے شک انگریزی زبان داخل ہونی چاہئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوبارہ دوسرے جلسہ میں لکھنؤ میں یہ بات پیش ہوئی کہ بجائے غیر ضروری اور غیر لازمی ہونے کے انگریزی لازمی اور کمپلسری کر دینی چاہئے۔ تو اس وقت بھی آپ نے شرکت اور تائید کی۔

شبلی اور ان کے رفقائے کار کے درمیان جو اسبابِ اختلاف تھے۔ ان میں شاید ایک حد تک تو ذاتیات کو دخل تھا۔ ندوہ کے بڑے اراکین اس زمانے میں حسب ذیل تھے۔

نائب ناظم	مولوی خلیل الرحمٰن
دارالعلوم کے تعلیمی ادارے کے معتمد	مولانا شبلی نعمانی
دفتر اصلاح کے معتمد	مولانا عبدالحی
صیغۂ مال کے معتمد	منشی احتشام علی رئیس کاکوری

قاعدے کی رو سے مولانا شبلی فقط درسیات کے صیغے کے معتمد تھے لیکن جوں جوں ندوہ ترقی کرتا گیا اور اس ترقی میں شبلی کی کوششوں کو زیادہ دخل ہوتا گیا۔ انھوں نے نظامت کے اکثر فرائض اور حقوق سنبھالنے شروع کئے اور اسے نائب ناظم (جو ناظم کی عدم موجودگی میں قائم مقام ناظم سمجھے جاتے تھے) اور دوسرے معتمدوں نے پسند نہ کیا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

اصل یہ ہے کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب بلکہ مولانا عبدالحی صاحب کو کسی قدر یقین ہے کہ میں ان لوگوں کے اختیارات کا ضائع اندازی کرتا ہوں۔ اور ان کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں۔ یہ صرف کر دیا۔ وہ نمایاں نہیں ہوتے۔

اس سے بھی بڑھ کر مذہبی عقائد اور عملی زندگی کا مسئلہ تھا۔ پہلے کی نسبت سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

مولانا کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام ایسی دو کتابیں تھیں جو مصنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود علماء کے نزدیک اعتراض کے قابل تھیں۔ ان کے بعض مباحث ٹھیٹھ مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے اس لئے علماء کی ایک جماعت جو متکلمین کی آراء و تحقیقات سے بے خبر تھی۔ ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لئے ان کو موزوں نہیں سمجھتی تھی۔

عملی زندگی کی نسبت بھی ان ہی کا بیان ہے:۔

پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورع و تقدس جو سیمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا اور اس لئے ان علماء کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا۔ اور اسی بنا پر وہ طلبہ کے لئے ان کی تعلیم و صحبت کو سخت مضر سمجھتے تھے۔

شبلی سے ثقہ علما کو جو شکایتیں تھیں۔ ان کا بیان شبلی کے جانشین نے نہایت دیانتداری اور بڑی وضاحت سے کر دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر سید سلیمان' از خود' ان باتوں کا اعتراف نہ کرتے۔ تب بھی جو کچھ انھوں نے کہا ہے' اس کی تائید میں اس طرح کی قطعی شہادتیں موجود ہیں کہ ان سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن شبلی کے پُر جوش عقیدت مندوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے۔ جو شبلی کے خلاف ایک لفظ سننا گوارا نہیں کرتا۔ خواہ اس کے لئے واقعات ہی کا کیوں گلا گھونٹنا پڑے۔ اور شبلی سے فرطِ عقیدت نباہنے کے لئے کتنے ہی علما و صلحا پر تبرّہ لازم آئے!

پروفیسر آل احمد سرور (اعظم گڑھی) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

پرانے رنگ کے علما شبلی سے ناراض تھے۔ یہی ہمارے نزدیک شبلی کی روشن خیالی، بیدار مغزی اور دور بینی کی دلیل ہے۔

پروفیسر صاحب نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ انھیں غریب علما سے اس درجہ حسن ظن کیوں ہے کہ ان کا کسی شخص سے ناراض ہونا ہی اس بات کی ایک قطعی دلیل ہو جاتا ہے کہ وہ شخص ضرور روشن خیال، بیدار مغز اور دور بین، ہے لیکن سرور صاحب اور علما کے نقطۂ نظر میں جو بنیادی فرق ہے۔ وہ آگے چل کر ان کے مضمون سے ٹپک پڑتا ہے۔ عطیہ بیگم کے نام شبلی کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

شبلی جذباتی آدمی تھے۔ پھر شاعر تھے۔ اچھی پڑھی لکھی خواتین سے متاثر ہوتے۔ وہ ان کی صحبت سے لطف اُٹھاتے۔ اور زندگی میں اچھے کام کرنے کا ولولہ حاصل کرتے!

سرور صاحب اور علما کے نقطۂ نظر میں جو فرق ہے۔ وہ ان ہی فقروں سے عیاں ہو جاتا ہے۔ سرور صاحب کے نزدیک اس بات میں کوئی قباحت نہیں کہ ایک شخص الندوہ کے صفحات پر تو پردہ کے حق میں زوردار مضمون لکھے اور جب علما کی محفل سے دور ہو تو بے پردہ خواتین کی صحبت سے لطف اُٹھائے۔ بلکہ زندگی میں اچھے کاموں کا ولولہ حاصل کرنے کے لئے اس صحبت کا محتاج ہو!

ہم یہ نہیں کہتے کہ سرور صاحب کا نقطۂ نظر ضرور غلط ہے۔ (اور ذاتی طور پر تو ہم بمبئی والے معاملے میں شبلی کو قابلِ الزام نہیں، قابلِ رحم اور مستحق ہمدردی سمجھتے ہیں) لیکن یہ بھی تو انصاف سے بعید ہے کہ ہم علما کو اس لئے تنگ نظر اور تاریک الذہن سمجھیں کہ وہ ایک ایسے شخص کو، کم از کم مذہبی علما

کا سرگروہ ہونے کا اہل نہیں سمجھتے!

شبلی کے عقائد اور ان کی عملی زندگی پر اعتراض کرنے والوں میں مولوی خلیل الرحمٰن سہارنپوری سب سے آگے تھے۔ وہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رح کے صاحبزادے اور محدثین دہلی و دیوبند کی ان روایات کے شیدا تھے۔ جن کے تحت مذہبی علما میں سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اپنی زندگی کیسی ہے؟ تقوے اور پرہیزگاری میں ان کی کیا حالت ہے اور ظاہری اعمال اور باطنی پاکیزگی میں ان کا کیا درجہ ہے؟ ان باتوں میں مولانا شبلی عام دنیاداروں سے بھی پیچھے تھے۔ ان کا مذہبی جوش اور علم وفضل بے اندازہ تھا۔ لیکن قدیم علما کے نزدیک ان باتوں سے سیرت کی کوتاہیوں کی تلافی نہیں ہوتی۔ چنانچہ مولوی خلیل الرحمٰن نے ان کی صحبت کو طلبا کے لئے سخت مضر قرار دیا[1]۔ اور ندوہ کے دیگر ارکان اور بہی خواہ (مثلاً شاہ سلیمان پھلواری شریف والے) بھی شبلی کو قریب سے دیکھنے کے بعد مولوی خلیل الرحمٰن کے ہمخیال ہوگئے۔

شبلی کے عقائد و اعمال میں کئی چیزیں ایسی تھیں۔ جو علمائے ندوہ کو بجا طور پر کھٹکتی تھیں لیکن صرف شبلی کی کمزوریاں ہی وجہ اختلاف نہ تھیں

---

[1] شبلی نے بعض خطوں میں لکھا ہے کہ مولوی خلیل الرحمٰن ناظم بننے کے لئے ان کی مخالفت کرتے تھے لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ جونہی شبلی کی آنکھیں بند ہوئیں۔ مولوی خلیل الرحمٰن نے مجلس اصلاح ندوہ کے ایما پر (جو شبلی کے حامیوں کی ایک جماعت تھی) فوراً نظامت سے استعفا دے دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انھیں نظامت عزیز نہ تھی۔ بلکہ ان کا منتہائے مقصود فقط ایک غیر ثقہ ہستی سے ایک مذہبی دارالعلوم کو آزاد کرانا تھا

بلکہ شاید ان کی بعض خوبیاں بھی، ایک ناسازگار ماحول میں مخالفت کا سبب بن گئیں۔

قدیم طریقۂ تعلیم کی حمایت اور قوم کی محبت شبلی کو علما کے دائرے میں لے گئی تھی لیکن عام بود و باش اور رہن سہن میں ان میں اور قدیم طرز کے علما میں بہت کم چیزیں مشترک تھیں۔ شبلی ایک رئیس کے بیٹے تھے۔ علی گڑھ میں جس ماحول میں رہے۔ وہ "ملایانِ مکتبی" کے مقابلے میں ضرور امیرانہ سمجھا جائے گا۔ حیدرآباد میں وہ ایک بلند مرتبہ سرکاری افسر تھے۔ "ان کے تین بھائی کامیاب وکیل اور بیرسٹر اور انگریزی طرزِ معاشرت کے دلدادہ تھے۔" ان سب باتوں نے انھیں ایک ایسے طرزِ رہائش کا عادی کر دیا تھا جو قدیم طرز کے علما کو بالکل انوکھا معلوم ہوتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اخیر عمر میں ان میں بڑی سادگی آ گئی لیکن عین اس زمانے میں بھی، جب وہ گراں زندگی کو قومی ترقی کا بڑا مانع قرار دیتے تھے اور سرسید کو اس کا سبب سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے بھائی کو لکھتے ہیں "اگر میرا قیام اعظم گڑھ میں ہوا تو ایک وکٹوریہ فٹن کی بھی ضرورت ہو گی۔" جس زمانے میں وہ قائم مقام نقل نویس تھے اور دس روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔" اس وقت بھی وہ گھر سے کچہری تک پیدل نہ جاتے تھے۔ اور دس روپے کی تنخواہ میں سے نو روپے گھوڑا گاڑی کے کرائے میں اُٹھ جاتے تھے۔ اخیر عمر میں جب اُنھوں نے برادرانِ وطن کے کام کرنے کے طریقے غور سے دیکھے۔ تو ان کی طبیعت میں بڑی سادگی آ گئی لیکن مزاج کی نفاست پسندی اب بھی باقی تھی اور ان میں اور قدیم طرز کے کوتاہ کیسہ اور سادہ بے تکلف علما میں ردّ و کد کے کئی مواقع نکلتے ہوں گے۔ سید سلیمان

لکھتے ہیں "ان کو بعض مولویوں اور عربی خوانوں کی پست ہمتی اور عدم صفائی وغیرہ سے سخت تنفر تھا۔ اس لئے علی الاعلان اس کی بھی برائی کرتے تھے۔" انھوں نے اس قسم کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے شبلی اور عام علما و مدرسین کے رنگِ طبائع کا اختلاف نظر آجاتا ہے:۔

ایک بار دارالعلوم میں ایک بڑے مدرس کے سامنے زمین پر آم کے چھلکے دیکھے تو فرمایا "آپ چھلکے کسی برتن میں کیوں نہیں رکھتے۔" انھوں نے کہا "بھنگی آئے گا تو اٹھالے جائے گا۔" بولے کہ "مولوی پہلے لکھتے ہیں۔ پھر مٹاتے ہیں۔"

اس اختلافِ معاشرت کے علاوہ، جو ایک نفیس پسند رئیس زادے اور عام مفلوک الحال، قدیم الخیال علما کے درمیان ناگزیر تھا۔ عام لوگوں کو شبلی کا طریق کار بھی کھٹکتا ہوگا۔ شبلی ازل سے بلند ارادے لے کر آئے تھے۔ علی گڑھ نے ان کی منزل مقصود معین کردی۔ اب ان کی ساری کوششیں اپنے منتہائے نظر کے لیے وقف تھیں لیکن ان کی منزل اتنی بلند تھی اور فرصت اس قدر قلیل کہ انھیں اپنے وقت کا استعمال بڑی کفایت شعاری سے کرنا پڑتا تھا ؎

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا!

شبلی نے بڑی خوشی سے، اپنے مقصدِ بلند کے لیے اپنے اوپر پابندیاں عاید کرلیں اور اپنے صرفِ اوقات کی کڑی نگرانی شروع کی۔ وہ علی گڑھ میں ہی تھے تو ان کے ملنے والوں کا دائرہ بہت محدود تھا اور سوائے علمی گفتگو کے وہ کسی چیز کو پسند نہ کرتے بلکہ ان کے اور سید محمود کے

اخیر عمر کے بگاڑ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں سوءِ مزاج کے سبب سید محمود "جدھر نکل جاتے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر گپ شپ میں مشغول رہتے اور وقت ضائع کرتے۔ مولانا ان کی اِس عادت سے زِچ ہو گئے۔" علی گڑھ میں تو شبلی پھر ایک ملازم تھے۔ ندوہ آئے تو یہاں ان کی حیثیت ایک افسر کی تھی اور انھوں نے افسرانہ انداز سے اپنے لمحات فرصت کا بچاؤ شروع کیا۔ سید سلیمان کہتے ہیں کہ مولانا کے دروازے پر جلی قلم سے یہ اعلان چسپاں رہتا تھا:۔

چار بجے سے پہلے ملنے کی اجازت نہیں۔

شبلی نے تضیعِ اوقات سے بچنے کے لئے جو طریقہ سوچا تھا۔ وہ ٹھوس مصلحتوں اور قومی بہی خواہی پر مبنی تھا اور فی الحقیقت قوم شاہراہِ ترقی پر دوسری قوموں کا اسی وقت مقابلہ کر سکے گی۔ جب تمام افراد (اپنی اغراض کے لئے ہی نہیں بلکہ قومی بہبودی کی خاطر) اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کریں گے لیکن ہندوستانی مسلمانوں میں، جو سب سے قیمتی شئے، یعنی وقت ہی کو سب سے ارزاں چیز سمجھتے ہیں اور جہاں بیکار لوگوں کی بیکار باتوں میں مصروف اشخاص کے وقت کا بیدردانہ خون ایک شعارِ قومی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مصلحتیں کون سمجھے۔ شبلی علی گڑھ میں تھے تو وہ "خشک اور مغرور" گنے جاتے تھے۔ لیکن جب ندوہ کے قدیم الخیال علما ان کے دروازے پر اوقات ملاقات کا اعلان پڑھتے ہوں گے تو دل ہی دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ ایک عجیب قسم کا مولوی ہے جس سے ملاقات پر اسی طرح پابندیاں ہیں جس طرح کلکٹر ضلع سے ملنے کے لئے!

شبلی ندوہ میں تھے تو ان کی خامیاں اور خوبیاں، دونوں ان کے رفقائے کار کی نظر میں کھٹکتی تھیں ؂

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

آپس کی اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ندوہ کے اکثر ارکان شبلی کو ندوہ سے نکالنے کے درپے ہو گئے۔ ان لوگوں نے چاہا کہ ایک کمیشن اس امر کی تحقیق کرے کہ ندوہ کے طلبا مذہبی امور کے کیوں پابند نہیں ہوتے اور چونکہ ان کے نزدیک شبلی کی صحبت کو اس میں بڑا دخل تھا۔ اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ ان کی بھی شہادت لی جائے۔ مولانا شبلی نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اس پر عمل نہ ہوا لیکن اس سے ان کی شہرت کو بہت ضعف پہنچا۔ وہ ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

> کمیشن کی شہرت نے بہت بُرا اثر پیدا کیا۔ اوّل تو تمام شہر میں مشہور ہے کہ فلاں شخص علیحدہ کر دیا گیا۔ دوسرے اس کی پختگی کے لئے شاہ سلیمان صاحب وغیرہ ہر جگہ یہ چرچا پھیلا رہے ہیں کہ فلاں شخص کی نسبت تمام ہندوستان میں بدعقیدگی اور الحاد کا شبہ عام ہو گیا ہے۔ اس لئے اب اس کے انتساب سے ندوہ کو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا۔

اس کے بعد ارکان نے فیصلہ کیا کہ ایک خاص جلسۂ انتظامیہ منعقد کر کے مولانا کو برطرف کر دیا جائے۔ چنانچہ جلسے کی تاریخ مقرر ہوئی اور چونکہ مجلس انتظامیہ کی اکثریت مولانا شبلی کے خلاف تھی۔ اس لئے اُن کی برطرفی کی تجویز کا پاس ہو جانا یقینی تھا لیکن مولانا کے مخالف سادہ دل مولوی لوگ تھے اور مولانا نے وکالت کا امتحان پاس کیا ہوا تھا اُنھوں نے

جلسے کو ہی خلافِ ضابطہ قرار دیا۔ اور مجمع کو بے نیل مرام منتشر ہونا پڑا!

اس کے بعد ندوہ کے محسن کرنل عبدالمجید خاں نے ارکان کے درمیان مصالحت کی کوشش کی۔ ان کے سامنے انتظامی جلسہ میں فریقین نے اپنی اپنی شکائتیں بیان کیں۔ ایک دوسرے کی تسلی کی گئی اور مقدس علما آپس میں گلے ملے۔ الندوہ میں شائع شدہ مضامین کے جن خیالات و عقائد کے علما شاکی تھے۔ ان سے پرہیز کا اعلان کیا گیا[۱]۔ علمائے دیوبند سے علانیہ معذرت کی گئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کا غبار نہیں گیا۔ مولانا شبلی اس مصالحت کے بعد شروانی کو آنے والے سالانہ جلسہ کی نسبت لکھتے ہیں۔ "ندوہ کی بساط پر یہ آخری بازی ہے جس پر اس کی موت و حیات کا مدار ہے"۔

سالانہ جلسہ جو مارچ ۱۹۱۲ء میں منعقد ہوا۔ ایک بڑا پُر رونق اور کامیاب جلسہ تھا۔ اس کو صدارت کے لئے مصر سے المنار کے ایڈیٹر سید رشید رضا تشریف لائے تھے۔ ان سے پہلے، دورِ حاضر میں مصر یا دوسرے ممالک اسلامی کی کوئی برگزیدہ ہستی ہندوستان کی اسلامی تحریکوں میں شرکت کے لئے یہاں نہیں آئی تھی۔ اس لئے ان کی آمد پر بڑا جوش پیدا ہوا اور اطرافِ ملک کی مشہور ہستیاں جمع ہو گئیں۔ جلسے میں بعض بڑی مفید تجویزیں منظور ہوئیں اور مولانا ابوالکلام اور مولانا شبلی کی پُر اثر تقریروں نے حاضرین کو مسحور کر دیا۔

اس جلسے سے مولانا شبلی کا اثر و رسوخ بڑھ گیا اور اُنھوں نے ارکانِ ندوہ کو دکھا دیا کہ خواہ ندوہ کے اندر یا ٹھیٹھ مذہبی حلقوں میں ان

---

[۱] الندوہ مئی ۱۹۱۰ء

کی قدر نہ ہو لیکن اطرافِ ملک میں اِن کا اثر و رسوخ بے انتہا ہے۔ بظاہر تو مولانا کی یہ بازی کامیاب رہی لیکن ندوہ کی بساط پر ان کی قسمت میں بالآخر شکست لکھی ہوئی تھی مگر اس آخری فیصلے میں ابھی کچھ دیر تھی!

ندوہ کی کشمکش اور مخصموں کے ساتھ ساتھ شبلی کی دوستیاں برابر قائم تھیں۔ ہم اُن کے اس پُر درد خط کا ذکر کر چکے ہیں جس میں انھوں نے اپنے رفقائے کار سے تنگ آکر، اسی زمانے میں، اپنے رفیقِ کار اور محبِ خاص، مولانا ابوالکلام آزاد سے فریاد کی تھی۔ عطیہ سے وہ خط و کتابت بھی جاری تھی۔ انھوں نے شبلی کو ۱۹۱۰ء کے شروع میں جو ''غضب آلود خط'' لکھا تھا۔ اس سے شبلی کے آبگینۂ دل کو بڑا صدمہ پہنچا اور انھیں نظر آ گیا کہ امیدوں اور آرزوؤں کے جو محل وہ بنا رہے تھے۔ ان کی بنیاد ریت پر تھی لیکن خوابہائے رنگین پریشاں ہو جانے کے بعد بھی رسمی، دوستانہ مراسم قائم رہے بلکہ اس سال کے آخر میں شبلی کو ایک ایسا موقع میسر آیا جس کی بدولت وہ ان مراسم کو زیادہ مستحکم کر سکے۔ دسمبر ۱۹۱۰ء میں الٰہ آباد میں نمائش تھی اور عطیہ بیگم اس سلسلے میں وہاں تشریف فرما تھیں۔ شبلی بھی الٰہ آباد پہنچ گئے۔ اور عطیہ صاحبہ سے اکثر ملتے رہے۔ ان ملاقاتوں پر خطوطِ شبلی سے تو کچھ روشنی نہیں پڑتی لیکن ان کی نسبت عطیہ بیگم کی اپنی ڈائری میں ذیل کا اندراج ہے۔

نمائش الٰہ آباد۔ دسمبر ۱۹۱۰ء

ان ایام میں مولانا شبلی بھی تشریف رکھتے تھے اور اکثر ہماری ملاقات کے لئے آتے تھے اور بلاناغہ ایک خوان میوہ اور اعلیٰ پکوان کا بھیجتے تھے۔ بجائے

بڈھے میاں گو کہ پُرانی وضع کے ہیں مگر خیالوں کی وسعت ایسی ہے کہ کاش آج کل کے نئی روشنی والوں میں ذرہ سی یہ بات ہوتی۔

نومبر ۱۹۱۲ء میں عطیہ بیگم کی شادی ایک یہودی آرٹسٹ مسٹر سیموئیل رحمین سے ہوگئی۔ شبلی اس کی نسبت مہدی حسن کو لکھتے ہیں:—

قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل وخوار بنا دیئے گئے لیکن کیا ۵ دسمبر[1] ۱۹۱۲ء کے بھی، جس دن کہ..... (عطیہ) ایک یہودی کو ہاتھ آئی۔ مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے اس لئے تو نہیں کہ ع ہوا کافر تو کافر مسلماں ہوگیا

خبر ع سبحہ را ز نار کردست وکند

شبلی نے نکاح میں تو شرکت نہیں کی لیکن اگلے سال جب وہ بمبئی گئے تو دُولہا دُلہن سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ ایک صحبت کا ذکر، عطیہ صاحبہ کی ڈائری میں بھی ہے:—

۳ جون ۱۹۱۳ء۔ اس شام کو تمام شام، مولانا شبلی نے ہمارے ہاں گزاری۔ انھوں نے ایک رباعی میرے لئے کہی اور ایک رحمین کے لئے!

عطیہ کی جو شادی پر کسی نے نکتہ چینی کی | کہا میں نے کہ جاہل ہے یا احمق ہے یا ناداں ہے
بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے ہیں مسلم کو | عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

شبلی از زبان سیموئیل (رحمین):—

ایک مدت سے مجھے شوق ہے تصویروں کا | اس سے بڑھ کر کوئی تفریح کی تدبیر نہ تھی
تھی عطیہ کی بھی خواہش کہ مرقع میں مرے | اور سب کچھ تھا فقط حسن کی تصویر نہ تھی

---

[1] عطیہ بیگم صاحبہ کی ڈائری میں نکاح کی تاریخ ۲۵ نومبر ۱۹۱۲ء درج ہے۔

علیگڑھ پر یلغار

ندوے کی بساط پر پہلی بڑی بازی شبلی نے ۱۹۱۲ء کے آغاز میں کھیلی۔ لیکن ان دنوں ان پر ایک عجیب نشۂ پیکار چھایا ہوا تھا اور ٹھیک اسی زمانے میں وہ ایک وسیع بساط پر اس سے ایک بہت بڑی بازی کھیل رہے تھے!

یہ بازی اسلامی ہندوستان کی قیادت کی بازی تھی اور ان کا مدِ مقابل ان کا پرانا ممدوح —— علی گڑھ —— تھا!

ہم شبلی کے خیالات کی اس تبدیلی کو نمایاں کر چکے ہیں جس کے تحت ان کو یقین آتا گیا کہ قومی مسائل کا حل قدیم یا جدید سے نہیں بلکہ جدید آمیز قدیم سے ہوگا۔ اور اس خیال کو انھوں نے ندوہ میں عملی صورت دینی چاہی۔ فی نفسہ یہ اقدام نیک تھا۔ قومی بہی خواہی کے جتنے بھی ادارے ہوں بشرطیکہ وہ خاموشی سے اپنا کام کیے جائیں اور قومی خدمت کے بجائے ایک دوسرے سے وقفِ پیکار نہ ہو جائیں قوم کے لئے مفید ہو سکتے ہیں لیکن شبلی کی دماغی ساخت اور ابتدائی نشو و نما کا تقاضا تھا کہ وہ قومی خدمت کے میدان کو بھی ہم اور اغیار، ہم اور حریف کے اس طرح کے نبرد آزما پیمانوں سے ناپیں۔ ایک تو وہ نسل کے راجپوت تھے۔ پھر مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے شاگرد، جن کے نزدیک علم ایک کامیاب

مناظرہ باز کا آلۂ کار تھا۔ اس کے علاوہ ان کا اپنا "مناظرانہ رنگِ طبیعت"! بد قسمتی سے شبلی ان افراد میں سے تھے، جو جب تک دوسرے کی پگڑی نہ اُتار لیں۔ انھیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ان کا اپنا عمامہ بھی سلامت ہے۔ وہ ازل سے جوہرِ قابل لے کر آئے تھے۔ لیکن جس روح فرسا ماحول سے انھیں سابقہ پڑا۔ اس نے ان کا طبعی توازن تہ و بالا کر دیا۔ شبلی ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدا میں نشاطِ خاطر کے سب سامان میسر تھے لیکن سوتیلی ماں کی آمد، حقیقی ماں کی آہ وزاری۔ قدیم تعلیم کی، جس میں شبلی نے فروغ حاصل کیا تھا، بے وقعتی۔ تلاشِ روزگار کی صعوبتیں۔ علی گڑھ کالج میں دوسرے علوم کے اساتذہ کے بالمقابل السنۂ شرقیہ کے اساتذہ کی بے قدری۔ ان سب باتوں نے شبلی کے عزِ نفس کو اس طرح مجروح کیا کہ ایک چوٹ کھائے ہوئے عضو کی طرح، ان کا دل، ہوا کے جھونکوں سے بھی دُکھ جاتا۔ جہاں ان سے اظہارِ ہمدردی ہوتا۔ وہاں انھیں "استہزا و شماتت" کے آثار نظر آتے اور جہاں حریفانہ مخالفت کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ وہاں بھی ان کی زخم خوردہ انانیت مخالفانہ خودنمائی کے لئے تیار ہو جاتی۔ شبلی کے رنگ طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں حزبِ اختلاف کی قیادت کریں۔ وہ علی گڑھ میں تھے۔ تو جلد ہی اس کے عزائم اور اساسی طریق کار کے مخالف ہو گئے۔ حیدر آباد گئے۔ تو وہاں بھی ہر ایک سے بیزار اور ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ندوہ آئے۔ تو یہاں بھی ہر وقت علما سے دست بگریباں رہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے والد سے شکایت و اختلاف کے باوجود، بڑی سعادت مندی اور برخورداری کا برتاؤ کیا لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ اگر ان کے اپنے گھر میں ان کے والد

کی خواہشات اور تجویزوں کے خلاف کوئی محاذ قائم تھا تو اس کے سرگروہ شبلی تھے!

یوں تو شبلی کے عام رنگ طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ حزب الاختلاف کے راہنما ہوں لیکن علی گڑھ کی مخالفت کے لئے' ایک خاص نفسیاتی سبب بھی تھا۔ اس کا بیان شبلی کے ایک ایسے واقف کار اور وفادار دوست کی زبانی سنئے جو علم نفسیات کے جدید نظریوں سے تو واقف نہ تھا لیکن جس نے اپنی بالغ نظری اور قوتِ مشاہدہ کی بنا پر شبلی کی شخصیت کا تجزیہ بالکل ایک جدید نفسیاتی عالم کی طرح کیا ہے مولوی عبدالحلیم شررؔ شبلی کے قیامِ علی گڑھ اور وہاں کے اثرات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

اب ان کے ساتھ ہی ان میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ ان میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے' **خودداری** کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت۔ علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداءً اس حیثیت سے پبلک میں متعارف کرایا کہ سید صاحب۔ کے گروہ کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہوگئی مگر خود مولانا شبلی کی خودداری اس حیثیت کو (اپنے سے بہت کم' بلکہ ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی) اپنی تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے۔ جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابلِ برداشت دیکھ کے' علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے' ندوۃ العلماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ

لہ خطوط وحدانی والی عبارت ہم نے رسالہ کتاب سے نقل کی ہے۔ شرر کا جو مضمون ہمیں ملا ہے۔ اس سے یہ غائب ہے اور بیان بے ربط ہے۔

سے ہیں علما کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے[1]۔

میں نے بارہا ان کو اس خیال سے روکا..... مگر انھوں نے نہ مانا۔

سرسید اور علی گڑھ کی نسبت شبلی نے اخیر میں جو رویہ اختیار کیا۔ اس میں ان کے خاص رنگِ طبیعت اور نفسیاتی ساخت کو بڑا دخل تھا۔ لیکن بعض خارجی اسباب بھی ایسے تھے جنھوں نے ان میں علی گڑھ کی مخالفت کو بھڑکایا اور ان میں سے ایک بڑا سبب سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمدؒ عبدہٗ کی تحریک کا اثر تھا۔

مولانا شبلی علی گڑھ میں ہی اس تحریک سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جب مصر گئے۔ تو شیخ محمد عبدہٗ سے ملے اور "دیر تک لطف کی صحبت رہی"۔ سید جمال الدین نے قیام حیدرآباد کے دوران میں ایک فارسی رسالہ ردِ نیچریہ میں لکھا تھا۔ شیخ محمدؒ عبدہٗ نے اس کا عربی ترجمہ ردِ دہرین کے نام سے کیا تھا اور اس کے شروع میں سید نے حالاتِ زندگی لکھے تھے۔ مولانا

---

[1] مولانا شبلی ندوہ کی ایک بالکل ابتدائی تقریر میں کہتے ہیں: "قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس حصہ کی فرمانروائی کے کامل الاختیار ہیں یا ہو سکتے ہیں"۔ اس کے بعد علما کی تنظیم اور ندوہ کو زیادہ موثر بنانے کے طریقے بتا کر، اس وقت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ جب ندوہ پوری طرح عروج پر ہوگا فرماتے ہیں۔ "ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعتِ اسلام اس کی ہدائتوں کی پابند ہو۔ اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے۔ اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کر سکے"۔

شبلی نے اپنے سفرنامہ میں ان حالات کا ایک اقتباس نقل کیا ہے اور شیخ کی مہارتِ فن اور زورِ تحریر کی تعریف کر کے ارباب فن کو مشورہ دیا ہے کہ وہ شیخ کے طرز کی تقلید کریں۔

سید جمال الدین افغانی اس زمانے کے ایک مشہور اور مقتدر اسلامی راہنما تھے بلکہ جو لوگ عملی کاموں سے نہیں بلکہ ارادوں اور منصوبوں سے ایک راہنما کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہیں ان کے نزدیک وہ انیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان تھے۔ ان کی اصل کی نسبت شبہ ہے کہ وہ ایرانی النسل تھے۔ یا افغانی الاصل لیکن وہ جوانی میں ہندوستان آگئے پھر مصر۔ فرانس۔ ترکی۔ ایران جا بجا پھرتے رہے۔ اور اپنے زورِ قلم اور زورِ زبان سے ان ملکوں کی سیاسیات پر اثر انداز ہوئے۔ وہ تحریکِ اتحادِ اسلامی کے بڑے حامی تھے لیکن عبرت کا مقام ہے کہ انھیں کسی اسلامی حکومت میں جم کر یا آرام سے رہنا نصیب نہیں ہوا اور جس شخص نے تحریکِ اتحادِ اسلامی کو پہلی مرتبہ عملی صورت دینی چاہی یعنی سلطان عبدالحمید وہ ان کا جانی دشمن ہو گیا۔ اور اس نے ان کو زہر دلوا دیا!

سید جمال الدین بلا کے ذہین وطباع اور ایک بڑی وجیہ و مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے لیکن انھیں عام طور پر کسی ملک میں بہ یک وقت دو چار مہینے یا ایک دو سال سے زیادہ قیام میسر نہیں آیا اور اس اُچٹتی نگاہ اور محدود معلومات[1] کی بنا پر انھیں افراد و اقوام کی نسبت فیصلہ کرنا پڑتا

---

[1] سید جمال الدین نے سید احمد خاں کی نسبت اپنی وسیع معلومات کے موتی جا بجا بکھیرے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ "انگریزوں نے احمد خاں کے ساتھ احسان کیا اور اس کے لڑکے محمود کو ہندوستان کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں میونسپل کمشنر بنا دیا۔"

تھا۔ چنانچہ بعض اوقات شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے۔ ان میں اور سرسید میں سوائے شدید اسلامی محبت کے کوئی چیز مشترک نہ تھی۔ سید جمال الدین تحریک اتحاد اسلامی کے سرگروہ تھے اور سرسید کا خیال تھا کہ جب تک عالم اسلام کے تمام اجزا اپنی اپنی جگہ خوشحال اور طاقتور نہ ہوں۔ ان کا اتحاد بھی موثر نہیں ہو سکتا اور کم از کم موجودہ سیاسی حالات میں تو اسے ایک عملی صورت دینا محالات سے ہے۔ اسی طرح طبیعتوں کا اختلاف تھا سید جمال الدین کا دل و دماغ آتشیں اجزا سے مرکب تھا۔ سرسید کے دل کی گہرائیوں میں بھی قومی حرارت بے حد تھی لیکن غدر کی ژالہ باری میں (جس نے اسلامی ہندوستان کا خرمن اقتدار تباہ کیا تھا) اگر سرسید کے سیاہ بال ہجوم غم سے سفید ہو گئے تھے تو وہاں ان کا دماغ بھی برف کی سل بن گیا تھا۔ اب وہ واقعات اور معاملات کو شباب کی کیف آور اور ولولہ انگیز آنکھوں سے نہ دیکھتے بلکہ ان کا مطالعہ خشک اور "نشہ شکن" منطق کی روشنی میں کرتے۔ سید جمال الدین شاید سرسید سے زیادہ ذہین اور تیز نگاہ تھے لیکن سرسید ان سے کہیں زیادہ ٹھوس اور ٹھوس عملی کاموں کے لئے ان سے زیادہ موزوں تھے۔ اسی طرح صورتِ حالات کا فرق تھا۔ سید جمال الدین، جب تمام عالمِ اسلام پر نظر ڈالتے تو انھیں برطانیہ کی بڑھتی ہوئی استعماری طاقت سے سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا لیکن جب سرسید ہندوستان کے خاص حالات کو دیکھتے تو انھیں خیال آتا کہ ہندوستان کے تو حالات ہی ایسے ہیں کہ یہاں برطانوی حکومت اور مسلمانوں میں اتحاد، آسان بلکہ ناگزیر ہے!

سید جمال الدین اور سرسید میں خلوص، قابلیت، بے انتہا قومی ہمدردی کے باوجود اس طرح کے بنیادی اختلافات تھے کہ سید جمال الدین کے لئے

ہندوستانی مسلمانوں کی خاص مشکلات کا اندازہ لگاتا یا سرسید کے ٹھوس طریقِ کار کی قدر کرنا سرے سے ناممکن تھا لیکن اس بُعد المشرقین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی، اس آتشیں قلم افغانی نے "سرسید" اور ان کے خاص احباب اور رشتہ کائے کار[1]" کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھئے اور اس بُڈھے ہندوستانی کی قسمت پر نہیں، بلکہ اسلامی اخلاق و تہذیب کے زوال پر سر پیٹ لیجئے: ۔

سگ از برائے استفصالِ استخوانے تملق مے کند۔ و دُم حرکت مے دہد۔ و سر بہ پائے معطی نہادہ، چہ خودے باشد، چہ بیگانہ، بجہت اظہارِ خلوص نیت روز زیادہ مے دہد۔ انسان از سگ ہم کمتر است۔ لاحول ولا۔ انسان را چناں مے زیبد۔ کہ در تملق و خضوع ہزار مرحلہ بہ سگ پیشی گیرد۔ و اگر دُم ندارد۔ ریش ہم کم از آں نیست۔ ناستودہ مرگ خاں ہمیں نکتہ را فہمیدہ ازاں بود۔ کہ آواز بر آورد۔ ریشے حرکت دارد۔ نان ہائے خود را حلال کرد۔ خدا کند۔ کہ ایں شکر سبب مزید نعمت گردد۔

کتا ایک ہڈی حاصل کرنے کیلئے خوشامد کرتا ہے۔ اپنی دُم ہلاتا ہے اپنے محسن کے پاؤں پر خواہ وہ اپنا ہو یا بیگانہ، سر رکھ دیتا ہے۔ اور اظہارِ خلوص کے لئے ؟ ؟ ؟ ۔ انسان کُتے سے بھی گیا گزرا ہے۔ لاحول ولا۔ اسے چاہئے۔ کہ خوشامد اور عاجزی میں کُتے سے بہت آگے نکل جائے۔ اگر اس کے دُم نہیں تو کم از کم ڈاڑھی تو ہے۔ ناستودہ مرگ خاں نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا۔ اور اس بات کیلئے تیار رہتا تھا۔ کہ آواز نکالے۔ ڈاڑھی کو حرکت دے۔ اور جو روٹی کے ٹکڑے اسے ملے ہیں۔ انھیں اس طرح حلال کرے۔ خدا کرے کہ یہ اظہار شکر مزید عنایات کا ذریعہ ہو!

---

[1] آثار جمال الدین افغانی از قاضی عبدالغفار ص ۱۴۵، ص ۱۴۶

سرسید کی نسبت قوم کے ایک سچّے (مگر پٹھان!) عاشق نے جس غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔ اس کے متعلق شاید بعض لوگوں کو خیال ہو۔ کہ یہ "غلبۂ" "حال" مذہبی اختلافات کی بنا پر تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں سید جمال الدین کا حال بھی سرسید سے مختلف نہ تھا اور ان پر بھی ضعف العقائد اور ترک صلوٰۃ کی بنا پر الحاد و کفر کے فتوے لگے تھے۔ الندوہ کی ایک اشاعت میں مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:۔

المنار جو مصر کا مشہور مستند مذہبی رسالہ ہے۔ اور جس کا ایڈیٹر سید رشید رضا علمائے مصر میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ اس نے ہماری نسبت جو نوٹ شائع کیا ہے۔ اس کا ترجمہ اخبار وکیل میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک عبارت کے سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ عبارت (کا ترجمہ) یہ ہے "یعنی شبلی پر لوگوں نے اعتزال اور نماز ترک کرنے کا الزام لگایا ہے۔ جیسا کہ اس کے پہلے اس ملک کے دو مصلحین پر یہ تہمت لگائی گئی تھی" وکیل نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے۔ کہ ان دو مصلحین سے سرسید اور نواب محسن الملک مراد ہیں لیکن درحقیقت المنار کا اشارہ شیخ جمال الدین افغانی اور مفتی محمدؐ عبدہٗ کی طرف ہے!

سید جمال الدین کی آتشیں طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ جم کر کوئی ٹھوس کام انجام نہ کرسکیں لیکن اسی آتش مزاجی کا نتیجہ تھا کہ وہ جہاں گئے۔ انھوں نے فضا کا جمود درہم برہم کردیا اور گرد و نواح میں ایک نیا جوش، ایک نئی چہل پہل، ایک نئی زندگی پیدا کردی۔ اُنھوں نے بعض بڑی عظیم الشان شخصیتوں کو متاثر کیا۔ جن میں شیخ محمدؐ عبدہٗ کا نام خاص امتیاز رکھتا ہے۔

شیخ محمدؐ عبدہٗ ایک زمانے میں مصر کے مفتیٔ اعظم تھے اور انھوں نے مصر میں ملحدانہ خیالات کو روکنے کی بڑی کوشش کی۔ شیخ اور شیخ کے ممتاز شاگرد علامہ

رشید رضا نے کلام مجید کی جو تفسیر لکھی ہے۔ بالکل سرسید کی تفسیر کے اصولوں پر ہے۔ لیکن مصر میں جو حالت جدید کی تھی (اور ہے!) اسے دیکھ کر وہ جدید کے بھی بہت مخالف تھے۔ جب شبلی سے شیخ محمدؐ عبدہٗ ملے تو انھوں نے ازہر کی ابتری تعلیم پر افسوس کیا۔ "لیکن اس کے ساتھ نئی تعلیم کے بھی سخت شاکی تھے اور کہتے تھے کہ "ھٰؤلاء اضل بیبیل" (وہ اس سے بھی بدتر ہے!)" شیخ نے "لائحۃ الاصلاح والتعلیم دینی" کی ایک تعلیمی سکیم بھی بنائی تھی۔ جس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں[1] کہ اگرچہ شیخ دس سال تک ازہر کے شیخ الجامعہ رہنے کے بعد بھی اسے ازہر میں جاری نہ کرسکے لیکن شبلی نے اسے ندوۃ العلما میں عملی جامہ پہنا دیا۔

سید جمال الدین کے اثر نے شبلی کو سرسید سے زیادہ بدظن کر دیا۔ اور شیخ محمدؐ عبدہٗ نے انھیں ایک ایسا راستہ دکھا دیا۔ جسے وہ احیائے دین اور اصلاح تعلیم کا واحد طریق کار سمجھنے لگے لیکن علی گڑھ کی مخالفت پختہ کرنے میں بعض مقامی اثرات بھی شامل تھے اور شاید اس میں شبلی کے قیام بمبئی کو بڑا دخل تھا۔ بمبئی شروع سے کانگریسی خیالات کا بڑا مرکز رہا ہے۔ سرسید کی مخالفت کے باوجود جو مسلمان کانگریس میں شریک ہوئے۔ ان میں سے بیشتر بمبئی کے تھے۔ اور اتفاق ایسا ہوا کہ جب ندوہ میں آجانے کے بعد ہر سال موسم گرما میں شبلی بمبئی آتے۔ تو ان کی زیادہ آمد و رفت ان مسلمان خاندانوں میں ہوتی۔ جو سرسید کے مخالف تھے۔

شبلی کے لئے اُفقِ بمبئی کا سب سے درخشندہ ستارہ بلکہ ماہتاب عطیہ بیگم تھیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو۔ الہلال۔ فروری۔ مارچ ۱۹۱۳ء مدارسِ اسلامیہ (۵۰۴)

جو کانگریس کے مسلمان پریذیڈنٹ اور سر سید کے سیاسی مخالف (جسٹس بدرالدین طیبّ جی کی ایک قریبی عزیز تھیں اور سیاسی معاملات میں اپنی خاندانی روایات کی شدت سے قائل تھیں۔ اُنھوں نے علی گڑھ کے بعض اداروں کی نسبت شبلی کے نام ایک خط میں جو خیالات ظاہر کیے تھے۔ انھیں ان کے اپنے الفاظ میں سُنئے :۔

کانفرنس (یعنی علیگڑھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) اور مسلم لیگ سخت ڈھکوسلے ہیں بُزدل لوگوں کے ـــــ انگریز جس قدر مسلمانوں کو بناتے ہیں۔ اُسی قدر یہ بنتے جاتے ہیں۔

شبلی "کم وقعت فرقہ مجدیدۂ ہند" کی نسبت عطیہ بیگم کے یہ الفاظ نقل کرکے مہدی حسن کو لکھتے ہیں :۔

میں تو بہ خدا ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں۔ گو "کافر" کے منہ سے نکلے ہیں۔

اپنی ہمخیال عطیہ بیگم کو اس خط کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

مدتوں کے بعد آج ایک ہم خیال ملا۔ کانفرنس (ایجوکیشنل کانفرنس) وغیرہ کی نسبت سب سے لڑنا پڑتا ہے کہ یہ کیا ڈھکوسلے ہیں۔ لیکن دنیا پاگل ہو رہی ہے۔ کس کو سمجھائے۔ مسلمان پالیٹکس میں آئے۔ تو جس طرح نادان بچہ بات بات پر مچلتا ہے۔ اور طفلانہ حرکتیں کرتا ہے۔

آج کل بہار مسلم لیگ کا اجلاس تھا۔ تمام ہندوستان کے لال بجھکڑ جمع تھے۔ ان کی تجویزوں اور خیالات پر ہنسی آتی ہے[1]۔

اس کے کچھ عرصے بعد انھیں ایک اور ہمخیال ملا جس سے علی گڑھ کالج کی نسبت

---

[1] خطوطِ شبلی ص ۴۸ - ۴۹

باتیں ہوتی رہیں۔ شبلی بڑے چاؤ سے اپنی آشنائے راز عطیہ کو اطلاع دیتے ہیں۔

اب کے دتی میں انعام الحق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور دیر تک صحبت رہی۔
شکر ہے۔ کہ وہ بالکل میرے ہمخیال ہیں۔ اور ان کا اعتقاد ہے۔ کہ مسلمان جس چیز
کو قبلۂ حاجات سمجھ رہے ہیں۔ وہ غلامی اور خوشامد کا کارخانہ ہے۔

مصر اور بمبئی کے اثرات کے علاوہ ایک اور چیز، جس نے شبلی کے دل میں سرسید اور علی گڑھ کی مخالفت کو مستحکم کر دیا۔ شاید ابو الکلام آزاد کا اثرِ صحبت تھا جو ۱۹۰۶ء میں کوئی سال، ڈیڑھ سال تک ندوہ میں مقیم رہے۔

جس وقت شبلی علی گڑھ کالج سے علیحدہ ہوئے۔ اس وقت وہ جدید کے مقابلے میں قدیم کے ترجمان تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ جدید اور قدیم کا ایک معجونِ مرکب بنا کر دیکھیں۔ کہ قوم کے لئے یہ کس حد تک مفید ہوتا ہے۔ لیکن علی گڑھ یا سرسید کے لئے ان کے دل میں ابھی کوئی خاص جذبۂ عناد و مخالفت نہ تھا۔ وہ کالج سے علیحدگی کے بعد بھی علی گڑھ آتے جاتے رہے۔ محسن الملک سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اور ۱۹۰۶ء تک ان کے خطوط سے چلتا ہے کہ وہ بڑی خوشی سے علی گڑھ کے کام میں دوبارہ گرفتار ہونے کے لئے تیار تھے۔ اس دوران میں فقط حیاتِ جاوید کے متعلق ہی ایک ایسا اظہارِ خیال ملتا ہے۔ جس سے سرسید کی مخالفت کا استنباط کیا جا سکتا ہے لیکن یہ استنباط بھی قطعی نہیں۔ اسے سوانح نگاری کے متعلق شبلی کے اس نقطۂ نظر کا نتیجہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس کا انھوں نے کئی جگہ اظہار کیا ہے۔

شبلی کی خانگی تحریروں میں دسمبر ۱۹۰۶ء سے پہلے اور عام تحریروں اور نظموں میں ۱۹۰۸ء سے پہلے ہمیں کوئی اندراج ایسا نہیں ملا جس سے قطعی

طور پر اندازہ لگایا جاسکے۔ کہ شبلی اب علی گڑھ کے مقابلے میں ایک حریفانہ انداز سے صف آرا ہونے والے ہیں۔ اس کے بعد شکایتوں اور الزاموں کا سُراغ ملنا شروع ہو جاتا ہے اور اس دوران میں جن اثرات سے انھیں سابقہ پڑا۔ ان میں، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔ ایک ایسے نوجوان کا ندوے میں قیام تھا جو شروع سے سرسید احمد کی مخالفت میں پختہ کار تھا۔ جس نے ۱۹۰۲ء میں ہی حیاتِ جاوید اور سرسید کے برخلاف لسان الصدق میں مضامین لکھے تھے اور جسے سرسید کی مخالفت میں اس قدر غلو تھا کہ حالی جیسے بُردبار اور فرشتہ خصلت انسان نے ایک زمانے میں اس کے اخبار الہلال کو ہدیتاً لینے سے انکار کر دیا!

شبلی اور ابوالکلام آزاد کی عمروں میں جو فرق تھا۔ اس کا لحاظ رکھ کے شبلی کا ایک سترہ سالہ نوجوان کے خیالات سے متاثر ہو جانا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن آزاد نہایت ابتدائی عمر میں پہلے درجے کے پختہ کار تھے اور شبلی کی دماغی ساخت اس طرح کی تھی کہ وہ قدیم کے ترجمان ہونے کے باوجود ہر سمت سے نئے اثرات قبول کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ جس سمت آزاد کے اثر صحبت نے شبلی کو کھینچا۔ اس سمت کے لئے ہر طرح کے طبعی، ذہنی، علمی اور سیاسی رجحانات تو پہلے سے موجود تھے۔ فقط اس صحبت میں ان رجحانات نے ایک واضح صورت اختیار کر لی۔

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی "عالم السرائر" اس راز سے پردہ نہ اُٹھائے۔ قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد کے قیام ندوہ کے دوران میں شبلی کا آزاد پر زیادہ اثر پڑا۔ یا شبلی اس ذہین اور تیز و طرار نوجوان سے زیادہ متاثر ہوئے۔ لیکن کم از کم یہ امر تو قرین قیاس ہے کہ اس دوران

یں دونوں کے درمیان جو گفتگوئیں ہوئیں۔ ان سے دونوں کا طرزِ عمل زیادہ واضح اور منضبط ہو گیا۔ حتےٰ کہ جب اربابِ علی گڑھ کے خلاف اعلان ۔ ـگ کا وقت آیا۔ تو شبلی اور آزاد دونوں پہلو بہ پہلو صف آرا تھے۔

ں کے درمیان، اس زمانے میں اس درجہ " اتحادِ خیال اور ل" تھا۔[1] کہ اس جنگ میں علی گڑھ کے خلاف جو اسلحے استعمال کئے ان کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آزاد کے دماغ کی اختراع ۔ یا شبلی کا عطیہ!!

ان نئے اثرات کے ساتھ ساتھ اب غیر سے شبلی کا ندوہ بھی جوان ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اس قابل ہوتا جاتا تھا کہ علی گڑھ سے ٹکر لے۔ اب شبلی کے خطوط میں علی گڑھ کی نکتہ چینیں اور علی گڑھ کے مقابلے میں ندوہ کی فضیلت کا اظہار شروع ہو گیا۔ ایک خط میں مہدی حسن کو مولوی عبدالسلام ندوی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

عبدالسلام نہایت ہونہار ہے۔ وہ پورا مصنف ہو سکتا ہے۔ اور ہو گا۔ انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے۔ ندوہ اس قسم کے جواہر کا چمکانے والا ہے لیکن علی گڑھ کی بے مہری ندوہ کو اُبھرنے نہیں دیتی۔

مہدی حسن، علی گڑھ سے شبلی کے روز افزوں اختلافات سے خوش نہ تھے۔ نہ انھیں یہ معلوم تھا کہ علی گڑھ نے ندوہ سے کون سی بے مہری برتی ہے اور نہ انھیں یہ پتہ چلتا تھا کہ ندویت کیا چیز ہے اور اس کا کیا

---

[1] حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی۔

فائدہ ہوگا۔ شبلی انھیں ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

> ندویت آپ کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن انصاف کیجئے۔ جن لوگوں کی آپ قدردانی کرتے ہیں۔ وہ کس کان کے جوہر ہیں۔ کالج کے یا ندوہ کے؟

ندوہ اب سنِ بلوغت کو پہنچ چکا تھا اور شبلی علی گڑھ کو خوشامد اور غلامی کو کارخانہ سمجھتے تھے لیکن انھوں نے اپنا اظہارِ خیال زبانی گفتگو اور نجی خطوط تک محدود رکھا۔ علی گڑھ سے ان کے ظاہری تعلقات برقرار رہے۔ ندوہ کے اسٹیج پر سب سے پہلے کوسِ انا ولا غیری شبلی کے نوجوان اور کیفِ انانیت سے سرشار دوست، مولانا ابوالکلام آزاد نے بجایا۔ جنھوں نے اپریل ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں "ندوۃ العلما کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود" کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز مضمون لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ نئے گروہ اور انگریزی تعلیم کے ترجمانوں سے کچھ نہیں ہوا۔ "صرف ندوہ ہی قومی ترقی کے لاینحل عقدے کو حل کر سکتا ہے"۔ اور دارالعلوم ندوہ کی سہ سالہ رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :۔

> ہمارے تنزل اور انحطاط کے تمام اسباب اس نقطے پر جا کر ختم ہوتے ہیں کہ قوم کے پریشان اور متفرق گلے کا کوئی راعی نہیں لیکن دارالعلوم (ندوہ) اپنی تعلیم و تربیت سے جو جماعت طیار کر رہا ہے۔ وہ اس بھٹکے ہوئے بے راہ گلے کو جمع کرے گا...... اس سے توقعات قائم کرنے میں جس قدر اسراف کیا جائے۔ کم ہے۔

اس مضمون پر علی گڑھ کے حامی چونکے اور اس کے جواب میں اٹاوہ کے البشیر نے "علی گڑھ کالج پر ایک اور حملہ" کے عنوان سے ایک آرٹیکل لکھا جس میں ارکان کالج کو مشورہ دیا گیا تھا کہ انھیں ندوہ سے قطعاً علیحدگی

اختیار کرنی چاہئے لیکن ندوہ کی باگ ڈور ایک بڑے ہوشیار اور سمجھدار منتظم کے ہاتھ میں تھی۔ شبلی نے فوراً اس آرٹیکل کا دوستانہ جواب لکھوا کر وکیل وغیرہ میں چھپوا دیا۔ اس کے بعد جب البشیر میں اس مسئلے پر مزید مضامین چھپے۔ تو مولانا نے خود الندوہ میں جواب لکھا اور مضمون نگار کی توجہ ان دوستانہ تعلقات کی طرف دلائی جو سرسید۔ نواب محسن الملک وغیرہ کے ندوۃ العلما سے تھے۔ مولانا شبلی غیر معمولی احتیاط کے انسان تھے۔ وہ ابھی "ابھی علی گڑھ کی خدائی" سے ڈرتے تھے اور کھل کر کچھ نہ کہتے تھے۔ لیکن ۱۹۱۱ء کے آخر اور ۱۹۱۲ء کے آغاز میں بعض ایسے واقعات پیش آئے۔ جنھوں نے اس احتیاط کی ضرورت ختم کر دی۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار ہوا اور اس موقع پر تقسیم بنگال، جس کے متعلق حکومت بار بار اعلان کر چکی تھی کہ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ منسوخ کر دی گئی۔ مسلمان بالعموم تقسیم بنگال پر خوش تھے۔ انھیں اس کی تنسیخ کا افسوس ہوا اور دوسرے گورنمنٹ کے فیصلے کا عام طور پر یہ نتیجہ سمجھا گیا کہ حکومت بنگالیوں کے ایجی ٹیشن سے دب گئی ہے علی گڑھ کالج کے سکریٹری، نواب وقار الملک دربار سے واپس آئے تو انھوں نے آکر پہلی فرصت میں "ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ حالت" کے عنوان سے ۲۰ دسمبر کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک پُرزور مضمون لکھا۔ جس میں نہایت متین اور مہذب طریقے سے گورنمنٹ کے فیصلے پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ بتا کر کہ "وفاداری غرض ہے۔ جوہر نہیں۔ اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے"۔ آخر میں کہا:۔

یہ آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد

جو اس وقت مشاہدہ میں آئے۔ یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ وہ ہماری قوتِ بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابلِ احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے۔ ہمارے سامنے موجود ہے۔

نواب وقار الملک نے اس موقع پر اور مضامین بھی لکھے اور خطوط میں بھی غم و غصہ کا اظہار کیا۔ لیکن ان کا ۲۰ دسمبر والا مضمون ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اسلامی ہندوستان کی سیاسیات کا ایک دور ختم ہوا اور دوسرا دور شروع ہوا۔ نواب وقار الملک نے گورنمنٹ کی "نئی پالسی" دیکھ کر جو رائے دی تھی۔ اُس کی مولانا محمدؐ علی نے کامریڈ میں حمایت کی اور اگلے سال مارچ میں 'مسلم لیگ' نے اس پر مہرِ توثیق ثبت کر دی۔ اب اربابِ علی گڑھ نے جو پالسی اختیار کی تھی۔ اُس کی ایک شق (کانگریس سے علیحدگی) کے علاوہ باقی سب سے مولانا شبلی دل و جان سے متفق تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کے علی گڑھ سے اختلافات محض اصول پر مبنی تھے تو اب ان کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ جس پالسی کو وہ فقط دل ہی دل' یا زیادہ سے زیادہ زبانی گفتگو اور خانگی خطوط میں کوستے تھے۔ اسے خود اربابِ علی گڑھ' نے کھلے بندوں ختم کر دیا تھا۔ اب ایک ختم شدہ سوال کو کھولنا اور گڑے مُردے اکھیڑنا بالکل غیر ضروری تھا لیکن مرے کو مارے شاہ مدار۔ جب حریف خاک و خون میں لوٹ رہا ہو۔ تو اس سے اچھا موقع اس پر ضربیں لگانے کا اور کیسے مل سکتا ہے؟؟

جب نواب وقار الملک کے مضمون سے ملک کی فضا بدلنی شروع ہوئی۔ اور کامریڈ اور زمیندار کی طرف سے نئی پالسی کی پرزور حمایت کی گئی۔ (الہلال ابھی طلوع نہ ہوا تھا!) تو اس مضمون کے چند مہینے بعد شبلی نے لکھنؤ کے مسلم گزٹ میں "مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جس کی پہلی قسط ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کے پرچے میں شائع ہوئی اور چوتھی قسط[1] ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی گذشتہ اور آئندہ پالسی سے بحث کی گئی تھی۔ مضمون پُرزور اور انشاپردازانہ خوبیوں سے معمور تھا۔ اس میں نواب وقار الملک کی اس "غلط منطق" پر اعتراض کیا گیا تھا کہ اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو گئے تو ان کی ہستی فنا ہو جائیگی۔ تیسری قسط میں (جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے بعد شائع ہوئی) لیگ پر بھی چُست فقرے کسے ہیں۔ لیکن یہ اختلافی معاملات ہیں جب کوئی اہلِ قلم

---

[1] مولانا کی زندگی میں فقط یہی چار قسطیں ہوئی تھیں۔ لیکن چوتھی قسط میں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی تائید کرتے ہوئے" مسلمانوں کی بت شکنی اور ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی بدسلوکی کا اس طرح ذکر کیا کہ ان کے مطابق ان کے" اعزہ و احباب بلکہ قریباً" تمام قوم" آزردہ ہو گئی۔ انھوں نے بھی تسلیم کیا کہ" اس مضمون نے بظاہر میزانِ عدل کا ایک پلہ بالکل جھکا دیا ہے"۔ اور تلافیٔ مافات کے لئے مضمون کی ایک اور قسط بڑھا دی۔ جس میں یہ لکھ کر کہ" ہندوؤں کی وفاداری کا زمانہ اکبر سے شروع ہوتا ہے"۔ اکبر کے اتحاد پرور کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا لیکن کسی مصلحت کی بنا پر مضمون کی یہ قسط شبلی کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی۔ بلکہ چوتھی قسط کے کوئی چار سال بعد اور مصنف کی وفات کے کوئی ایک سال بعد حلیۂ طبع سے آراستہ ہوئی۔

کسی مسلک کی حمایت میں قلم اُٹھاتا ہے۔ تو ضرور ہے کہ اس کی تحریر میں ایسی باتیں آجائیں۔ جن سے اس کے مخالف اختلاف کریں گے لیکن مسلم گزٹ کے مضمون کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں علی گڑھ پر حملہ ہے۔ یا اس میں سرسید سے بے انصافی کی گئی ہے۔ مولانا شبلی نے سرسید کی کئی خوبیاں بیان کر دی ہیں۔ ان کے زمانے سے اب تک حالات میں جو تبدیلیاں ہوئی تھیں انھیں تفصیل سے گنا دیا ہے اور اپنے بیان کو دلیلوں کی مدد سے مدلل اور واضح کیا ہے۔

مسلم گزٹ کے سلسلۂ مضامین کے زیادہ مباحث سیاسی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان پر نقد و تبصرہ ہمارا کام نہیں۔ لیکن ان مضامین میں بعض امور غیر اختلافی اور متفق علیہ بھی ہیں اور ان کا ذکر، شبلی کے سوانح نگار کے لئے بڑا خوشگوار ہے۔ ان میں سے ایک قابلِ ذکر چیز ان قابلِ احترام ہندوؤں کے ایثار کا بیان ہے۔ جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے صرف قوتِ لایموت پر اپنے آپ کو قومی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے اور جن کا ہندوؤں کی موجودہ ترقی اور عروج میں بڑا ہاتھ ہے۔ شبلی کو خدا نے غیر معمولی قوتِ حِس عطا کی تھی۔ بعض ذاتی اور قومی اثرات نے انھیں قدیم کا ترجمان بنا دیا تھا۔ لیکن وہ بالطبع جدت پسند تھے اور نئے اثرات کے قبول کرنے یا کم از کم چکھنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے ان کا یہ رجحانِ طبع انھیں بعض اوقات عجیب و غریب کوچوں میں لے گیا اور ان کی سریع الحسی اور شدتِ احساس نے ان کی قوتِ فیصلہ پر بھی اثر ڈالا۔ لیکن کم از کم اس ذکاوتِ حس کی وجہ سے ان کے لئے نئے رجحانات اور اثرات کا اندازہ لگانا زیادہ آسان تھا اور انھوں نے ہندوؤں کی بعض قابلِ اخذ خوبیوں کی طرف اس وقت اشارہ کیا۔ جب

مسلمانوں کے قومی اداروں میں ان خوبیوں کا کوئی احساس نہ تھا۔ شبلی اپنے سلسلۂ مضامین کی پہلی قسط میں لکھتے ہیں: -

ہم سنتے ہیں کہ گرو کل میں تین سو وہ بچے تعلیم پا رہے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کر دی ہے اور جو باوجود دولتمندی کے زمین پر سوتے اور کمبل اوڑھتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ پونا میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے۔ جہاں اس وقت (۲۹) بی۔ اے پالیٹکس کی تعلیم پا رہے ہیں جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے اور ان کی کل زندگی کی قیمت (۳۰) روپیہ ماہوار ہوگی۔ ہم واقف ہیں کہ فرگوسن کالج پونا میں (۱۹) پروفیسروں نے جن میں سے کوئی بی۔ اے سے کم تعلیم یافتہ نہیں۔ صرف (۷۵) روپیہ ماہوار پر اپنی تمام عمر فروخت کر دی ہے۔ ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آریہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد ہندو پروفیسر ہیں جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں، یہ تمام پرجوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات، ہمارے دلوں میں ایک ذرہ جنبش نہیں پیدا کر سکتے۔ ہماری قومی درسگاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی پیدا نہیں کی۔

ان سلسلۂ مضامین کی دوسری قابلِ ذکر غیر اختلافی بات، کونسلوں اور کمیٹیوں میں مسلمان اور ہندو ممبران کے طریق کار کا فرق تھا۔ شبلی کے خیالات وعقائد سے اختلاف مشکل نہیں۔ ان کی ذاتی سیرت میں بھی آسانی سے پیچ وخم ڈھونڈے جا سکتے ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک کامل الفن اور پختہ کار انسان تھے۔ اُن کی زندگی کا تعمیری دور اس محسن قوم کی صحبت میں گزرا تھا جس کی نگاہ بلند اور جس کا معیار کڑا تھا اور شبلی اس معاشرے میں

اس کے سچے جانشین تھے] وہ "پکے پان" تھے۔ انھیں نئی نسل کی ادھوری کوششیں اور "لیچ پچی" باتیں کس طرح گوارا ہوتیں۔ اس کے علاوہ وہ دیکھتے تھے۔ (اور یہ بات آج بھی صحیح ہے) کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی رفتارِ ترقی میں اس لئے فرق ہے کہ پچھلے پچاس سال سے مسلمان محنت سے جی چرانے لگے ہیں۔ کونسلوں کے مسلمان نمائندوں کی نسبت شبلی لکھتے ہیں :-

> کونسلوں میں ہمارے قائمقاموں نے کس قسم کے سوالات کئے؟ کیا کیا اصلاحی تدبیریں پیش کیں؟ جن مسئلوں پر گفتگو کی۔ وہ بازاری گفتگو تھی۔ یا کسی ماہرِ فن کی؟ ہندو ممبر تمام ریکارڈوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اعداد بہم پہنچاتا ہے اور کوئی اہم۔ دقیق اور نتیجہ خیز سوال کرتا ہے۔ جو عام آدمیوں کے دائرۂ معلومات سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا پولٹیکل قائم مقام کونسل میں نہایت زور شور سے الزام دینے کے لہجہ میں سوال کرتا ہے کہ گورنمنٹ کو معلوم ہے یا نہیں کہ فلاں مختار خانہ میں وکلاء کے بیٹھنے کے لئے کرسیوں اور مونڈھوں کا انتظام ہے یا نہیں؟

آگے چل کر یہی شکایت انھوں نے یونیورسٹی کے مسلمان ارکان کی نسبت کی ہے :-

> یونیورسٹی کو پالٹیکس سے کوئی تعلق نہیں۔ یونیورسٹی کے فیلو مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہندو ممبر جب یونیورسٹی کے اجلاس میں جاتا ہے تو مسائل زیرِ بحث پر تیار ہو کر جاتا ہے۔ تمام ریکارڈوں کو ساتھ رکھتا ہے۔ لوگوں کو پہلے سے اپنا ہم رائے بناتا ہے۔ بخلاف اس کے ہماری تعلیم گاہوں کے تربیت یافتہ جلسہ میں جا کر بھی یہ خبر نہیں رکھتے۔

کہ ان کے سامنے کیا ہونے والا ہے؟

شبلی کو یہ شکایت صرف جدید اداروں کے مسلمان نمائندوں سے نہ تھی۔ بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی تھی۔ وہ سید سلیمان ندوی کو اخیر عمر کے ایک خط میں ندوہ کی اصلاحی کارروائیوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

حالت یہ ہے کہ ایک شخص بھی ایسا نہیں جو قانون اور قاعدہ کو پڑھے۔ اور قانونی حیثیت سے تیار ہو۔ آرٹیکل۔ لکچرز۔ وغیرہ میں صرف لفاظی درکار ہے۔ وہ موجود ہے۔ باقی اصل ضابطہ اور قاعدہ کی بحث آجاتی ہے تو سب رہ جاتے ہیں۔ ابوالکلام صاحب کا تار آیا کہ تم لکھ کر بھیج دو۔ مجھ پر یہ بہت جبر ہوتا ہے۔

شبلی کے مسلم گزٹ والے سلسلۂ مضامین میں 'غیر اختلافی' کارآمد باتیں موجود ہیں اور کم از کم ان مضامین کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں علی گڑھ یا سرسید کے ساتھ کسی عداوت یا عناد کا اظہار ہے۔ شبلی نے سرسید اور علی گڑھ کے متعلق چلے پھپھولے پھوڑنے کے لئے مولوی وحیدالدین سلیم کے مسلم گزٹ کو نہیں، بلکہ مولوی ابوالکلام آزاد کے الہلال اور نثر نہیں نظم کو ذریعۂ اظہار بنایا شاید جس وقت انھوں نے مسلم گزٹ میں مضامین لکھنے شروع کئے تھے اس وقت ان کے دل میں سرسید اور علی گڑھ کے خلاف وہ غیظ و غضب نہ تھا۔ جو الہلال کے اجرا اور مولوی ابوالکلام آزاد کے با اثر مضامین پڑھنے کے بعد ہو گیا جن کا شروع سے ان باتوں کی نسبت ایک خاص نقطۂ نظر تھا اور جنھوں نے "علی گڑھ کے ایوانِ غلامی" کو گرا دینا شروع سے ہی الہلال کا مقصدِ اولیٰ قرار دیا تھا۔

جہاں تک طرزِ تحریر کی مختلف اصناف کا تعلق ہے۔ شاید مولانا شبلی

سمجھتے ہوں کہ نثر میں پھر بھند ، دل سے بات کرنی پڑتی ہے۔ (اُردو میں اس وقت تک نیا جذباتی اور انشا پردازانہ طرز تحریر کسی خاص کامیابی کے ساتھ استعمال نہیں ہوا تھا) اور ممکن ہے۔ خشک دلیلوں میں حریف کا پلّہ بھاری ہو جائے۔ اس کے خلاف نثر کے بجائے تمسخر آمیز شعر کا حربہ ستعمال کرنا چاہئے۔ جس کا کوئی جواب نہیں اور جس میں اس لطیف طریقے سے وار ہو سکتا ہے کہ دشمن کو پتہ بھی نہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے!

مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ء کے آخر اور ۱۹۱۳ء کے شروع میں جو وقتی نظمیں لکھیں ان کا ایک حصہ " مسلم لیگ " کے متعلق ہے۔ جس میں لیگ کے نئے مقصد " سوٹیبل سیلف گورنمنٹ " کے لفظ سوٹیبل کو استہزا و تمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔ کلیات شبلیؔ میں ان نظموں کے شروع میں سید سلیمان ندوی کا ایک پیراگراف درج ہے جس میں اس زمانے کے حالات بیان کر کے مسلم لیگ کے خلاف تحریک اُبھارنے میں شبلیؔ نے جو حصّہ لیا تھا۔ اس کا ذکر کیا گیا ہے اور لکھا ہے:-

بالآخر یہ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ لیگ مر گئی۔

آج لیگ کی زندگی، بلکہ شان و شوکت دیکھ کر شاید بعض ناظرین کو سید سلیمان کے اس فقرے پر ہنسی آئے اور فی الواقع یہ فقرہ، الفاظ کے استعمال

لہ فقط الہلال کے پانچویں نمبر میں " نظرے خوش گذرے " کے عنوان سے کشاف (شبلی) نے، نثر میں ایک ہجویہ مضمون لکھا تھا جس میں علی گڑھ کی تطبیق " الحاد و غلامی " اور " فرنگی محل کی فرنگی عربی " پر طعن کئے گئے تھے۔ لیکن ایک مضمون کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اور شعر و سخن کا راستہ اختیار رہا۔

اور بیان واقعات میں ارباب ندوہ کی غیر معمولی احتیاط کا ایک ستھرا نمونہ ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شبلی کی نظموں کا قوم کے ایک طبقے پر کافی اثر پڑا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خیالات سے قطع نظر، شبلی کی اس زمانے کی نظمیں فنی نقطۂ نظر سے اس درجہ کامیاب ہیں کہ ان کا موثر ہونا ناگزیر تھا۔ شبلی نے بمبئی کی فارسی غزلیں لکھنے اور وہاں کے کوئے محبت میں سیر کرنے سے پہلے بھی اردو نظمیں لکھی تھیں مگر سوائے مثنوی صبح امید کے باقی سب "تبرکات شبلی" ہیں لیکن اس واقعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بند زبان کھل گئی ہے۔ حافظ کی نسبت ایک قصہ مشہور ہے کہ شاخ نبات سے محبت کرنے کی بدولت ان کی زبان رواں ہو گئی اور ان کے اشعار میں اثر اور درد آ گیا۔ پتہ نہیں۔ شبلی پر بھی کوئی ایسا عمل کارگر ہوا لیکن اتنا ضرور صحیح ہے کہ چمن زار بمبئی میں گل چینی کے بعد ان کے اشعار میں ایک خاص نفاست شستگی اور دل آویزی آ گئی۔ اس کے بعد انھوں نے اگر کنکر بھی اٹھا کر دشمن کی طرف پھینک دئے ہیں تو وہ پھول بن گئے ہیں۔ ان کے الفاظ کا انتخاب، ترکیبوں کی چستی اور طنزیہ طرز بیان بالکل بے پناہ ہے۔ "ہر شعر مخالف پر تیر و نشتر کا اثر رکھتا ہے اور پھر گرفت کی کوئی چیز نہیں۔"

شبلی کی سیاسی نظموں سے بحث ہمارے دائرۂ غور و فکر سے باہر ہے۔ لیکن شبلی کے سوانح نگار کے لئے وہ نظمیں، جن میں وہ علانیہ اپنے قدیم محبوبین سرسید اور علی گڑھ کے خلاف صف آرا ہوئے۔ بڑی دلچسپی رکھتی ہیں اور ان کا مطالعہ کئے بغیر اس انقلاب کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ جو شبلی کے خیالات میں ہوا اور جسے شبلی ان نظموں کی مدد سے قوم کے خیالات میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان نظموں کا زیادہ حصہ اُس وقت لکھا گیا۔ جب سنہ ۱۹۱۲ء اور سنہ ۱۹۱۳ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا سوال

درپیش تھا اور شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد اس بات پر مصر تھے کہ مسلم یونیورسٹی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے جس قدر کالج اور اسکول ہیں۔ ان سب کے الحاق کا اختیار ہونا چاہیئے۔ شبلی کی نظموں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے باقی قوم بھی انکی ہمخیال ہوگئی۔ لیکن حکومت ہمہ جاتی یونیورسٹیوں کی موجودگی میں علی گڑھ یونیورسٹی کو یہ حق نہ دیتی تھی اور شاید علی گڑھ میں بعض لوگ آمادہ ہو گئے (جیسا کہ ہندو یونیورسٹی کی بنیاد کے بعد انھیں بالآخر کرنا پڑا) کہ اس حق کے بغیر ہی یونیورسٹی شروع کر دیں۔ مولانا شبلی اور مولا ابوالکلام آزاد کو علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی سے جو دلی محبت ہو سکتی تھی۔ اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ جب قوم نے یونیورسٹی کے لئے چندہ دیا اور قوم ایک الحاقی یونیورسٹی کے حق میں ہے تو علی گڑھ والوں کو اس کا کوئی استحقاق نہیں کہ وہ ایک مقامی یونیورسٹی قبول کریں۔ مولانا نے اس موضوع پر ایک طنزیہ نظم لکھی۔ جو ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں شائع ہوئی۔ اس کا ایک بند ہے ؎

ان ابلہانِ قوم کو سمجھائے یہ کوئی
عالم کے کاروبار کا اک انتظام ہے
جس کی بنا تمام ہے تقسیم کار پر
یعنی ہر ایک شخص کا اک خاص کام ہے
عالم میں ہیں ہر اک کے فرائض جدا جدا
یہ مسئلہ مسلمہ خاص و عام ہے
ہے مقتدی کا فرض فقط امتثال امر
ارشاد و حکم منصب خاص امام ہے
تھا قوم کا جو فرض وہ تھا بس عطائے زر
آگے مقدسین علی گڈھ کا کام ہے
یہ بارگاہِ خاص ہے نہیں مجلس عوام
سمعاً و طاعۃً یہ ادب کا مقام ہے

مخصوص ہیں مناصب خاصانِ بارگاہ
تم کون ہو جو تم کو یہ سودائے عام ہے؟

ایک اور نظم کا عنوان تھا۔ "مسئلہ المحاق"۔ اس کے چند شعر ہیں ؎

مجھ کو حیرت تھی کہ تعلیم غلامی کیلئے — وہ بنا کونسا پہلو ہے کہ جو باقی ہے
پہلے جو بزم گہِ خاص تھی اس فن کیلئے — آج جو کچھ ہے اسی درس کی مشتاقی ہے
ایسکے ہوتے ہوئے پھر لیگ کی حاجت کیا تھی — جب وہی بادہ گلگوں ہے وہی ساقی ہے
شیخ صاحب نے کہا مجھ سے باندازِ لطیف — اسمیں اک راز ہے اک نکتہ اشراقی ہے
یوں تو ہیں جامعۂ درسِ غلامی[۱] دونوں — فرق یہ ہے کہ وہ محدود یہ الحاقی ہے!

دوسرے شعر میں علی گڑھ کالج کا صاف نام نہیں لیا گیا۔ بلکہ اس کے لئے "بزم گہِ خاص" کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ لیکن ایک رباعی میں "کالج" اور "خوشامد" کا ذکر صاف صاف ہے ؎

---

[۱] شبلی نے سرسید کی وفادارانہ پالسی کی بنا پر علی گڑھ کو "جامعۂ درسِ غلامی" کہا ہے لیکن اگر ندوہ کے اوراقِ تاریخ ذرا تلاش سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس معاملے میں یہ علی گڑھ سے بھی بڑھا ہوا تھا اور ندوہ کے سفیر باقاعدہ اطاعتِ حکومت کا وعظ کیا کرتے تھے!

۱۹۰۸ء کے الندوہ میں، جس کے مولانا شبلی ایڈیٹر تھے۔ مولوی غلام محمد صاحب شملوی وکیل ندوۃ العلما کی ایک نا آموز تقریر کا ذکر کر کے ندوہ کی پالسی پر حسبِ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے:-

"ندوہ اگرچہ پالٹیکس سے بالکل الگ ہے۔ لیکن چونکہ اس کا اصل مقصد روشن خیال علما کا پیدا کرنا ہے اور اس قسم کے علما کا ایک ضروری فرض یہ بھی ہے کہ گورنمنٹ کی برکاتِ حکومت سے واقف ہوں اور ملک میں گورنمنٹ سے وفاداری کے خیالات پھیلائیں۔ اس لئے مولوی صاحب موصوف نے ندوہ کا فرض ادا کیا۔ ندوہ سے اور سفرا اور وکلا بھی موقع بموقع اس فرض کو انجام دیتے رہتے ہیں۔"

لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے
جاچکا قافلۂ اب بانگ جرس باقی ہے اب بھی آجاتی ہے کالج سے خوشامد کی صدا

لفظ "کالج" کی تشریح کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن کلیاتِ شبلی کے مرتب سید سلیمان ندوی ان باتوں میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے اس پہ ایک حاشیہ چڑھا کر نمایاں نمایاں تر کر دیا ہے۔ "علی گڑھ کالج، جواب علی گڑھ یونیورسٹی ہے"!

اسی مسئلۂ الحاق کے سلسلے میں ایک نظم ہے۔ "عرض نیاز بہ جناب مالک الملک" اس میں اربابِ علی گڑھ حکومت کے سامنے سر بہ سجود ہو کر عرض کرتے ہیں ۵

ہم تو ازل سے حلقہ بگوش نیاز ہیں یہ سر ہمیشہ زیرِ قدم پائمال ہے
ہم نے تو وہ ثنا و صفت کی حضور کی جو خاص شیوۂ صفتِ ذوالجلال ہے
آیا کبھی نہ حرفِ تمنا زبان پہ یاں تک تو ہم کو پاسِ ادب کا خیال ہے
اُردو کے باب میں جو ذرا کھل گئی زباں اب تک جبین پہ عرقِ انفعال ہے
دامن غبارِ حق طلبی سے رہا ہے پاک بہ فیض خاص رہبرِ دیرینہ سال ہے
آیا جو حریت کا کبھی دل میں وہم بھی سمجھا دیا کہ جوشِ جنوں کا اُبال ہے
ابتک اسی طریق پہ ہیں بندگانِ خاص گو صحبتِ عوام میں کچھ قیل و قال ہے
الحاق سے کچھ اور نہ تھا مدعائے خاص بس اک عمومِ درسِ وفا کا خیال ہے
یعنی کہ پھیل کر یہ زمانے کو گھیر لے ابتک جو مختصر یہ علی گڈھ کا جال ہے

پانچویں شعر میں رہبرِ دیرینہ سال سے مراد وہی "پیر دیریں" ہے جس کے متعلق شبلی نے کوئی پچیس سال پہلے مثنوی صبح امید میں لکھا تھا ۵

دیکھا تو وہاں بہ جاہ و تمکیں آیا نظر اک پیرِ دیریں
صورت سے عیاں جلالِ شاہی چہرے پہ فروغِ صبح گاہی

وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورتِ مجسّم!
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

ارباب علی گڑھ پر سب سے مسلسل طنز ایک نظم میں ہے جس کا عنوان تھا "مذہب یا سیاست"۔ لیکن اگر اس کا عنوان ہوتا۔ "ارباب علی گڑھ سے خطاب" تو شاید نفسِ مضمون زیادہ واضح ہو جاتا۔ اس نظم کے بعض اشعار ہیں:

تم کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو — دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں — کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہمرنگِ شرار
یا کوئی جذبۂ ملک و وطن تھا جس نے — کر دئیے دم میں قوائے عملی سب بیدار
آپ دونوں سے کئے دیتے ہیں ہم کو محروم — نہ سیاست ہے نہ ناموس شریعت کا وقار
مدتوں بحثِ سیاست کی اجازت ہی نہ تھی — کہ وفاداریٔ مسلم کا تھا یہ خاص شعار
اب اجازت ہے مگر دائرۂ بحث ہے یہ — کہ گورنمنٹ سے اس بات کے ہوں عرض گزار
ہم کو پامال کئے دیتے ہیں ابنائے وطن — ڈر ہے پس جائے نہ یہ فرقۂ اخلاص شعار
اب رہا جذبۂ دینی تو وہ اس طرح مٹا — کہ ہمیں آپ ہی آنا ہے اب اس نام سے عار
وضع میں، طرز میں، اخلاق میں، سیرت میں کہیں — نظر آتے نہیں کچھ حرمتِ دیں کے آثار
آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم — اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا — کہ نہ گھٹتا کبھی ناموسِ شریعت کا وقار
آج ہر بات میں ہے شانِ تفرنج پیدا! — آج ہر رنگ میں یورپ کے نمایاں ہیں شعار
ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود — کہ جہاں تک انھیں معقول بتائیں اغیار
نہ شریعت، نہ سیاست تو پھر اب کس کیلئے؟ — یہ تگ و دو ہے، یہ شورش ہے، یہ غل ہے یہ پکار؟

۱۹۱۲ء کے آخر میں شبلی کامرانی کے نشے میں جھوم رہے تھے۔ اس سال کے

نصفِ آخر میں کلکتہ سے ان کے محبِ خاص اور رفیق کار، مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال جاری کیا۔ اور چند ہی مہینوں میں اس نے جو اثر و اقتدار حاصل کر لیا۔ اس سے یہ خیال بیجا نہ تھا کہ قومی معاملات کی باگ اس کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور رہے گی۔ ترکی کے معاملات کو اسلامی ہندوستان کے مسائل پر اہمیت دینے کی جو پالسی اس نے شروع کی تھی۔ (اور جو سرسید کی پالسی کے عین مخالف تھی)۔ وہی بالآخر کامریڈ۔ ہمدرد۔ زمیندار کو اختیار کرنی پڑی۔ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے پر اس نے علانیہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے ٹکر لی تھی اور اس میں کامیاب رہا تھا۔ اس وقت ہر طرف شبلی اور ان کے ہمنوایوں کا دور دورہ تھا۔ شبلی کے جو حریف تھے۔ وہ یا تو کونوں میں چھپے ہوئے تھے۔ یا شبلی اور شبلی کے رفقائے کار کے اشاروں پر چل رہے تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ قومی قیادت کی بساط پر جو بازی شبلی نے کھیلی تھی۔ اس میں وہ کامیاب رہے تھے۔ اس حالت میں اگر ان پر فاتحانہ غرور و تفاخر طاری ہو جاتا۔ تو کیا تعجب تھا۔ اس نشہ آور حالت کا بیان ان کے اپنے پُر کیف الفاظ میں سُنئے ؎

وہ دن گئے کہ بتکدہ کو کہتے تھے حرم
وہ دن گئے کہ خاک کو دعویٰ نور تھا

وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کے ساتھ بھی
ہر بوالہوس خمارِ سیاست میں چور تھا

وہ دن گئے کہ "شاعِرِ اوّل" کا حرف حرف
ہم پایۂ کلام سخن گوے طور تھا

اب معترف ہیں دیدہ ورانِ قدیم بھی
اس نقشِ سیمیا میں نظر کا قصور تھا

اس دستِ مرتعش میں نہ تھی قوتِ عمل
اک کاسۂ تہی بہ سر پر غرور تھا

یہ لمعۂ سراب، نہ تھا چشمۂ بقا
یہ تیرگی تھی جس کو سمجھتے تھے نور تھا

آئینِ بندگی میں تملق کی شان تھی
اخلاص و صدق شائبۂ مکر و زور تھا

ان کی دُکان کی وہ ہوا اب بگڑ چلی　　جن کے گھروں میں جنسِ وفا کا وفور تھا
اب یہ کھلا کہ واقفِ سِر تھا اسی قدر　　جو جس قدر مقامِ تقرب سے دور تھا
ہردم برادرانِ وطن کی بُرائیاں　　ظاہر ہوا کہ فتنۂ اربابِ زُور تھا

سب مٹ گیا سیاستِ سی سالہ کا طلسم
اِک ٹھیس سی لگی تھی کہ یہ شیشہ چور تھا!



آخری مشکلات و مصائب

شبلی کے لئے ۱۹۱۲ء کا سارا سال اور ۱۹۱۳ء کا آغاز انتہائی کامرانی کا زمانہ تھا۔ ندوہ کا سالانہ جلسہ بڑا کامیاب رہا۔ شبلی کی سب سے بڑی تصنیفی مہم نہایت ہمت افزا حالات میں شروع ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ، کہ حریفوں کے پرشکوہ قصر و ایوان دھم سے زمین پر آ گرے اور ان کے کھنڈرات کے بالمقابل شبلی کے خیالات کا دلفریب محل، ساری قوم کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دل خوش کن صورت حالات کیا ہو سکتی ہے لیکن قدرت کی ستم ظریفیاں غضب کی ہیں شبلی کو کیا معلوم تھا کہ جو دیوار وہ بلند کر رہے تھے۔ وہ خود اس کی زد میں آ جائیں گے اور جو آگ وہ روشن کر رہے تھے۔ وہ سب سے پہلے ان کی امیدوں کا خرمن تباہ کرے گی!!

شبلی نے قوم میں جوش اور شوق آزادی پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ واقعات نے بھی ان کا ساتھ دیا اور ایک دو سال میں قوم کے خیالات میں ایک انقلاب آ گیا۔ شبلی نے اپنے نئے خیالات کا اظہار کلکتہ کے 'الہلال' لاہور کے 'زمیندار' اور لکھنؤ کے 'مسلم گزٹ' میں کیا تھا۔ الندوہ میں ان خیالات کو جگہ دی لیکن مئی ۱۹۱۲ء میں وہ الندوہ کی ادارت سے مستعفی ہو گئے اور کارکنوں نے ان کی جگہ دارالعلوم کے ایک مدرس مولوی عبدالکریم کو یہ خدمت تفویض کی۔ اس وقت عام جوش اور بے چینی کا زمانہ

تھا۔ اور زمانۂ حال کی سیاسی تحریکوں کو مضبوط بنانے کے لئے زمانۂ قدیم کی مذہبی ترکیبیں استعمال ہو رہی تھیں۔ مولوی عبدالکریم نے بھی نئے خیالات کا ساتھ دینا چاہا اور اپنی ادارت کے پہلے پرچے میں ہی جہاد پر ایک فقیہانہ طرز کا مضمون لکھا۔ جسے مولانا شبلی نے خلافِ مصلحت اور قابلِ اعتراض قرار دیا اور مقامی اراکین کا ایک جلسہ بلا کر انھیں کہا کہ مولوی عبدالکریم کے خلاف کچھ کارروائی کی جائے۔ بلکہ ان اراکین کا بیان ہے کہ مولانا نے انھیں دھمکی دی تھی کہ اگر وہ کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ تو مولانا یہ معاملہ گورنر تک پہنچائیں گے۔[1]

موجِ کوثر میں ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مولانا کی یہ ساری کوشش بندہ کو عتابِ حکومت سے بچانے کے لئے تھی۔ لیکن موجِ کوثر کی اشاعت کے بعد حیاتِ شبلی شائع ہوئی ہے اور اس میں مولانا شبلی اور مولوی عبدالکریم کے جو تعلقات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ معاملہ ایک مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سید سلیمان، مولوی عبدالکریم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> موصوف (مولوی عبدالکریم) اچھے خاصے طباع اور ذہین تھے مگر افسوس ہے کہ اس ذہانت کا رُخ دوسری طرف تھا۔ وہ بہت جلد دوسروں کے حلقۂ اثر میں آگئے۔ جنھوں نے ان کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا مدِ مقابل بنا کر کھڑا کیا۔

اس کے علاوہ جب مضمون کی اشاعت اور مقامی اراکین کے جلسے کی تاریخوں پر غور کریں۔ تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ یہ کارروائی ایک "مدِ مقابل"

---

[1] الہلال ۲۳ ر اپریل ۱۹۱۳ء ۔ ص ۲

کی شکست کے لئے تھی۔ ندوہ کو عتابِ حکومت سے بچانے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ یہ مضمون جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا اور مولانا نے جلسہ ۲۸ جنوری ۱۹۱۳ء کو بلایا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس مضمون کی بنا پر حکومت کو ندوہ سے کوئی باز پرس کرنی تھی۔ تو وہ مضمون کے ایک، دو، تین مہینے بعد تک کر لیتی۔ یہ حقیقت، کہ سات مہینے تک کوئی باز پرس نہ کی گئی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ حکومت یا تو اس مضمون سے بے خبر تھی یا وہ ایک خشک فقیہانہ مضمون کا جس میں فقط جہاد کے مذہبی مسائل بتائے گئے تھے۔ نوٹس لینا غیر ضروری سمجھتی تھی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ جب خود ندوہ والوں نے مولوی عبدالکریم کو چھ ماہ کے لئے معطل کر دیا اور مولانا شبلی نے اس فیصلے کی باقاعدہ اطلاع حاکمِ ضلع کو دی اور پھر، اس کے بعد جلسۂ انتظامیہ نے یہ حکم منسوخ کیا تو اس وقت کمشنر نے کہا۔ کہ ایڈیٹر کو "کچھ نہ کچھ تنبیہ ضروری" ہے لیکن سات ماہ تک حکومت کے کوئی نوٹس نہ لینے کا صاف مطلب یہ ہے۔ کہ اگر مولانا شبلی حکام تک یہ معاملہ نہ پہنچاتے تو وہ اس میں کوئی دخل نہ دیتے۔

بہر کیف مولانا اس وقت طبقۂ احرار کے راہنما تھے اور نہایت پر جوش مضامین اور تیز تیز نظمیں لکھ رہے تھے۔ جب عوام کو معلوم ہوا کہ آزادی اور مذہب پرستی کے اس دعویدار نے ایک رکنِ اسلامی پر مضمون لکھنے کی پاداش میں ندوہ کے فقیہ اول کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تو ان کے خلاف لکھنؤ میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ مولانا کے مخالفین نے، جو پہلے بھی مولوی عبدالکریم کے طرفدار تھے، جلتی پر تیل ڈالا اور قومی اخبارات، مثلاً مسلم گزٹ نے شبلی کے خلاف سخت سخت، مضامین لکھے۔ مولانا اس ایجی ٹیشن سے گھبرا گئے۔ پہلے تو لکھنؤ چھوڑ کر بمبئی کا رخ کیا اور پھر وہاں سے دارالعلوم کی معتمدی سے اپنا استعفےٰ بھیج دیا

اس کے بعد دوسرے معتمدین، مثلاً مولوی عبدالحی اور منشی احتشام علی اپنی معتمدیوں سے اور بعض اراکین اپنی رکنیت سے مستعفی ہوئے۔ لیکن جولائی کے تیسرے ہفتے میں جلسہ انتظامیہ ہوا۔ اس میں مولوی خلیل الرحمٰن صاحب مستقل ناظم بنائے گئے۔ ندوہ کے قدیم محسن کرنیل عبدالمجید خاں سرپرست بنے اور مولوی عبدالحی اور منشی احتشام علی نائب ناظم مقرر ہوئے۔ اب ندوہ کا کام نئے سرے سے باقاعدہ چلنا شروع ہوا۔

شبلی نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد مسجد کانپور کا واقعہ پیش آیا جس نے قوم میں طرابلس و بلقان کی لڑائیوں سے بھی زیادہ جوش پیدا کیا۔ مولوی عبدالکریم کے واقعہ سے طبقۂ احرار میں مولانا کی ساکھ کم ہوگئی تھی۔ اب انھیں موقعہ ملا کہ پھر سے اس طبقے میں داخل ہوں۔ اس وقت تک ان کی سیاسی نظمیں کشاف۔ نقاد یا اسی طرح فرضی ناموں سے شائع ہوئی تھیں۔ اب انھوں نے علانیہ اپنے نام سے نظمیں شائع کرائیں اور نظمیں بھی پہلے سے کہیں زیادہ جوشیلی، موثر اور اشتعال انگیز تھیں۔ ایک نظم کا، جس میں حکومت سے خطاب تھا۔ آخری مصرع تھا۔ ع

آپ ظالم نہیں، زنہار یہ ہم ہیں مظلوم!

ایک نظم کا عنوان تھا "علمائے زندانی" ؎

مساجد کی حفاظت کیلئے پولس کی حاجت ہے
خدا کو آپنے مشکور فرمایا عنایت ہے
عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہراہ سے یہ صدا آئے
مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانے کی ضرورت ہے
پنہائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں
یہ زیور سید "سجاد" عالی کی وراثت ہے
یہی دن ہیں کہ اگر ہیں کشتگانِ خنجرِ اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیز دل سب سے پہلے جائیں دیں | کہ یہ بچے ہیں انکو جلد سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں | کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

ایک اور واقعہ میں اسیرانِ کانپور سے خطاب کیا تھا ؎

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار | ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ | یعنی افسوس یہ زنجیر کے قابل ہی نہیں

ایک اور قطعہ تھا ؎

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی | اگرچہ صدمہ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرہ خوں | کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

شبلی نے واقعۂ کانپور پر دل ہلا دینے والے شعر لکھے لیکن نظم و نثر کے موتی پرونا اور بات ہے اور عملی ایثار کے میدان میں اتر نا کارِ دگر۔ اور بدقسمتی سے اب شبلی کو یہ امتحان پیش آگیا۔ ان کے تیز اور شوخ اشعار سے لکھنؤ کے احرار میں تو ان کی ساکھ بحال نہ ہوئی۔ لیکن حکومت میں ان کا جو اعتبار تھا۔ وہ جاتا رہا۔ جنوری ۱۹۱۴ء میں کوئی سرکاری پارٹی تھی۔ جس میں مولانا بھی شریک تھے۔

(ع یارِ ما آں دارد و ایں نیز ہم!)

اس میں لفٹننٹ گورنر صاحب سے سامنا ہوا تو انھوں نے کانپور کی نظموں کی نسبت شکایت آمیز بلکہ طعن آمیز فقرے کہے اور چیف سکریٹری نے بھی شکایت کی۔

پارٹی میں تو مولانا نے چیف سکریٹری کی یہ کہکر تسلی کرنی چاہی۔ "کہ یہ اتفاقیہ خلاف معمول بات ہوئی۔ ورنہ میں نے تو ہمیشہ بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔" لیکن قیاس ہے کہ شاید حکام ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ وہ یکم فروری کو حکیم اجمل خاں کو ساتھ لے کر چیف سکریٹری کی خدمت میں گئے اور معاملے کو صاف کرنا چاہا لیکن وہ اس وقت بھی کبیدہ خاطر

رہے۔ چنانچہ مولانا نے واپس آکر رات ہی کو ایک رقعہ لکھ کر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو بلایا اور اُن سے ایک انگریزی تحریر لکھوا کر بارگاہِ حکومت میں اپنی صفائی پیش کی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اس رقعے کی نسبت لکھتے ہیں :-

تحریر بالا شب کو ملی۔ میں اسی وقت گیا۔ مولانا بہت دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے۔ ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آجکل مجھ سے بدظن ہے۔ خصوصاً معاملہ کانپور کے متعلق میری نظموں سے۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں مجھے آج مسٹر برن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے تھے۔ وہ بہت کبیدہ خاطر تھے۔ حالانکہ اس سے پیشتر نہایت اخلاق و تپاک سے ملتے تھے۔ تم اس کے نام ایک مفصل چٹھی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدت العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آتی ہیں۔ دور ہوں۔ چنانچہ اس پر میری تمام تصانیف شاہد ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں میں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک رزولیوشن بھی پاس کرایا۔ پھر معاملہ مولوی عبدالکریم میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی۔ اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں۔ رہا واقعہ کانپور کے متعلق نظمیں تو وہ ایک ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں۔ جس سے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔

اِس معذرت نامے سے مولانا کے تعلقات حکومت سے تو بحال ہو گئے لیکن ندوہ بدستور ان کے حیطۂ اقتدار سے باہر رہا۔ اُنھوں نے استعفےٰ ایک اضطرار کی حالت میں، حرکت مذبوحی کے طور پر دے دیا تھا اور اب اپنے اس فعل پہ پچھتا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شاگردوں سے ایسے مضامین شائع کروانے شروع کئے۔ جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس جلسے نے شبلی کا استعفےٰ منظور کیا۔ اسے اس کے منظور کرنے کا اختیار نہ تھا۔[1] وغیرہ۔ سید سلیمان ندوی۔ مولوی مسعود علی نے اس کا خوب پراپاگنڈا کیا۔ لیکن اس کا ندوہ کے کارکنوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد مولانا شبلی لکھنؤ آئے اور ندوہ سے کوئی باقاعدہ تعلق قائم کئے بغیر طلبا کو حدیث بخاری کا درس دینا شروع کیا۔ طلبائے ندوہ کا ایک بااثر طبقہ مولانا کے ساتھ تھا۔ اور ملک کے اخبارات میں ان کے حق میں ایجی ٹیشن کر رہا تھا۔ مولانا کے لکھنؤ آجانے سے طلبا میں ایک عام بے چینی پھیل گئی اور ندوہ کے اراکین نے اسے روکنے کے لئے طلبہ کو خارج اوقات میں کسی سے درس لینے کی ممانعت کر دی۔

جب مولانا کے حامیوں کی یہ کوششیں سرسبز نہ ہوئیں۔ تو ۷ مارچ ۱۹۱۴ء کو طلبا نے سٹرائک کا عام اعلان کر دیا۔ مولانا کا بیان تھا کہ وہ سٹرائک کے خلاف تھے لیکن مولوی عبدالسلام ندوی نے اس سٹرائک سے پہلے ایک خط لکھا تھا۔ جس کی نسبت الہلال نے بھی کہا کہ اس خط میں "جتنے الفاظ لکھے گئے۔ ان میں کوئی لفظ بھی کسی عقلمند آدمی کا لکھا ہوا معلوم

---

[1] مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۵۲ ۔ حصہ دوم ص ۹۰ وغیرہ۔

نہیں ہوتا۔" اس میں منجملہ دوسری باتوں کے مولانا احمد علی محدث کی شائع کردہ صحیح بخاری کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ خط کا آخری فقرہ تھا" اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو۔ یہ مولانا کا حکم ہے" اور خط میں کہا گیا تھا۔ سرکشی اور سٹرائک کا اب وقت آیا تھا" اس سٹرائک سے مولانا کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچا۔ مذہبی مدارس میں سٹرائک کا یہ پہلا واقعہ تھا اور ڈر تھا کہ اگر یہ بدعت پھیل گئی۔ تو ان مدارس کے لئے سخت مضر ہو گی۔ علما نے عام طور پر فتوے دئے کہ یہ سٹرائک ناجائز ہے اور جب مولوی عبدالباری ندوی نے الہلال کلکتہ میں اس کے جواز میں سلسلۂ مضامین شروع کیا تو دیوبند کے مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کے خلاف ایک زبردست تردیدی مضمون لکھا۔

سٹرائک کے سلسلے میں دیوبند کے علما نے علانیہ شبلی کی مخالفت کی اور فریق مخالف کا ساتھ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری کا ان کے والد اور ان کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے دیوبند میں بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ دوسرے مولانا شبلی؛ دیوبند کے خلاف کئی جگہ زہر اگل چکے تھے۔ تیسرے اگر مولانا نے ندوہ کو علی گڑھ کا حریف بنانا چاہا تھا۔ تو اس کے

ؔ ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں۔" کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم حرم بنائیں گے۔" ایک اور خط میں ہے" دارالعلوم (ندوہ) کی کل میں نہایت ذلیل پرزے لگائے گئے۔ کیا قوم کو اس قدر امیدیں دلاکر دیوبند سے بھی گھٹیا مال دینا چاہیے۔" الندوہ کے ایک نمبر میں سید سلیمان (؟) نے دیوبند اور دوسرے ممتاز عربی مدارس کا ذکر کرکے لکھا" یہ تینوں مدرسے عصبیت وجمود کے مخزن اور مقتضیات زمانہ سے بے خبر تھے۔ جہاں سے ہر سال بیسیوں فراغت کے شملے لہراتے ہوئے نکلتے ہیں۔" (جلد ۴۔ نمبر ۷)

ساتھ ساتھ دیو بند کے حریف بھی تھے۔ چنانچہ اس موقعہ پر اربابِ دیوبند نے پوری طرح منتظمین ندوہ کا ساتھ دیا۔ جب اسٹرائک شروع ہوگئی اور مولوی مسعود علی ہڑتالی طلبا کو لے کر الگ مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ تو مولانا نے انھیں لکھا:۔

تم نے مدرسہ الگ کر لیا اور فرض کرو۔ چند روز چلا بھی سکے تو بحث یہ ہے کہ کب تک؟ اور اس سے ان کو کیا تنبہ ہوگا۔ وہ دیو بند وغیرہ سے لونڈے بلوالیں گے۔

جب یہ اسٹرائک بھی کامیاب ہوتی نظر نہ آئی۔ تو مولانا کے حامیوں نے دہلی میں مجلس اصلاح ندوہ کا ایک عام جلسہ بلانا چاہا۔ اس سے مولانا کے مخالف بھی زیادہ سرگرم ہوئے اور انھوں نے جلسے سے پہلے بعض علما کے فتوے شائع کئے۔ جنھوں نے علم الکلام اور کلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر شبلی کو کافر قرار دیا تھا۔ ان فتوؤں کی نسبت مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

جلسہ کے دن چار فتوے الگ الگ تقسیم ہو رہے تھے۔ جو مولوی عبدالحق (مفسر تفسیر حقانی) سے تیار کرائے گئے تھے۔ سفرائے ندوہ کے ذریعے اور شہر میں ان کی اشاعت کرائی گئی۔ چنانچہ رائے بریلی کی دیوار سے ایک صاحب اتار کر میرے پاس لائے"

اصلاحی کانفرنس کا جلسہ دس مئی ۱۹۱۴ء کو مولوی ثناء اللہ امرتسری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دونوں فریق اور ان کے حمایتی جلسے میں موجود تھے۔ ندوۃ العلما کے معاملے میں مولانا کے سب سے پُرجوش ساتھی یا ان کے شاگرد اور رفقائے کار (مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد) تھے۔ یا وہ لوگ جو طبقۂ علما سے باہر تھے (مثلاً نواب سید علی حسن خاں۔ خواجہ غلام الثقلین

مرزا حیرت دہلوی۔ سید جالب دہلوی) ملک کے اکثر علما (مثلاً فرنگی محل کے مولانا عبدالباریؒ۔ دہلی کے مولوی عبدالحق حقانی۔ پھلواری شریف کے شاہ سلیمان۔ دیوبند کے مولانا محمود الحسن) مخالفین شبلی کے ساتھ تھے۔ ان میں سے بعض جلسے میں تشریف نہ لائے تھے۔ لیکن پھر بھی شبلی کے مخالفین کثیر تعداد میں موجود تھے اور ان میں فقط علما نہ تھے۔ بلکہ علی گڑھ کے ارباب حل و عقد بھی (مثلاً نواب حاجی محمد اسحٰق خاں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں) جو علامہ شبلی کی طنز گوئی کے زخم خوردہ تھے۔ جلسے میں شریک تھے۔ اور مولانا شبلی کے خلاف قدیم اور جدید دونوں کے ترجمان جمع تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنانِ مدارس کی ہمدردی کے نام سے علی گڑھ کالج کے اربابِ اقتدار اور مدرسہ دیوبند کے علما بھی مدعیوں کے ساتھ تھے۔

شبلی کے خلاف علما اور اربابِ کالج کی یہ متفقہ صف آرائی بڑی عبرت آموز ہے۔ جب شبلی قومی خدمت کی وادی میں راہ پیما ہوئے۔ تو اُنھوں نے دعوے کیا تھا کہ وہ قدیم اور جدید کے درمیان سنگم کا کام دیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ قدیم اور جدید کے درمیان ایک رابطۂ اتحاد قائم کرنے کے بجائے اُنھوں نے دونوں سے کچھ اس طرح کی بے رُخی برتی کہ دونوں ان کے خلاف ہو گئے اور اب وہ شبلی کی راہنمائی میں نہیں، بلکہ ان کی مخالفت میں، یکدل ویکزبان تھے! ؎

شادم کہ بر انکارِ من شیخ و برہمن گشتہ جمع
کز اختلافِ کفر و دیں خود خاطرِ من گشتہ جمع

شبلی کی زندگی میں عبرت و نصیحت کا بڑا سامان ہے۔ ان کی سیرت میں

ایک دو چیزیں نظر کو کھٹکتی ہیں لیکن اگر انھیں ایک کمزور صحت اور کمزور اعصاب والے انسان کی فروگزاشتیں سمجھ کر یا علم و ادب کے ایک صیقلی آئینہ کا زنگار خیال کر کے نظر انداز کر دیں تو دیکھنے والے کو شبلی کی زندگی میں قابلیت۔ ایثار۔ بلند ہمتی۔ مسلسل جد و جہد۔ فنی پختہ کاری۔ حب قومی۔ دع ما کدر دخذ ما صفا؛ دولت کی بے قدری نفاست پسندی اور تنظیم اوقات کے بڑے کارآمد سبق ملتے ہیں۔ بالخصوص جو کوئی ادب کو بطور ایک فن کے اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے جدید اردو نثر میں فقط دو ہی لائق تقلید استاد ہیں۔ آزاد اور شبلی۔ لیکن شبلی کی زندگی میں دوسروں کے لئے عبرت بھی ہے اور اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ سچی قومی خدمت کے لئے قابلیت۔ ایثار۔ شدید مذہبی حمیت اور ذہن با تدبیر کافی نہیں۔ شبلی میں یہ سب کچھ بدرجہ اتم موجود تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی قومی زندگی نہ صرف ان کے لئے سوہان روح بنی رہی بلکہ اس کی وجہ سے قوم میں علما و اکابر اور قدیم و جدید کے درمیان غیر ضروری اور مضر اختلاف کا وہ دروازہ کھلا جو آج تک بند نہیں ہوا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جہاں شبلی میں بڑی خوبیاں تھیں وہاں سیرت کے ایک دو بنیادی نقص بھی تھے اور سچے قومی خادم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی سربلندی کا سامان کر کے اپنے آپ کو قومی خدمت کا ایک بے عیب آلہ کار بنائے۔ اسے چاہیئے کہ وہ ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کر کے دیکھتا رہے کہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے۔ اس میں اس کی (پنہاں) انانیت اور اس کی ذاتی طبعی کمزوریوں کو دخل تو نہیں۔ شبلی کے "زود اشتعال جذبات"[1] اور "مناظرانہ عادت"[2] انہیں ایک

---

[1] و [2] شبلی کے متعلق یہ دونوں جملے جانشین شبلی، سید سلیمان ندوی کے ہیں۔

ایسی راہ پر لے گئے جس سے قوم میں ایک مہلک کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس سے ندوہ کو بھی نقصان پہنچا اور شبلی کی ذاتی مخالفت کا بھی ایسا سامان ہوا کہ ہر خیال کے لوگ ان کے خلاف صف آرا ہو گئے!

اصلاح ندوہ کے نام سے دہلی میں جو جلسہ ہوا۔ اس میں مولانا محمد علی مرحوم بھی شریک تھے اور اس زمانے میں ان کا قومی معاملات میں بڑا دخل تھا۔ انھوں نے حالات کو دیکھ کر اور فریقین سے مشورہ کرنے کے بعد ایک تو سٹرائک کو ختم کرنے کا انتظام کیا۔ اور دوسرے یہ طے کیا کہ پچھلے واقعات کی تنقید شروع کر کے کشمکش کو طول نہ دیا جائے۔ بلکہ آئندہ کے لئے توجہ کی قوت بڑھائی جائے اور ایسے قاعدے جاری ہوں۔ جن سے منتظمین ندوہ کو خود مختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔

شبلی کو مولانا محمد علی کے طریق کار سے مایوسی تو ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس کے مطابق نہ انھیں استعفیٰ واپس ملتا تھا اور نہ ہی موجودہ کارکنوں میں تغیر ہوتا تھا۔ لیکن انھوں نے ساری کارروائی اصلاح ندوہ کے نام پر اُٹھائی تھی اور اصلاح کا تعلق آئندہ سے ہوتا ہے۔ ماضی سے نہیں۔ اس لئے یہ اصول کی بنا پر کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ جلسے میں ان کے مخالفوں کا اتنا زور تھا کہ جو کچھ مولانا محمد علی تجویز کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کامیابی محال تھی۔ چنانچہ انھیں بھی اس طریق کار سے اتفاق کرنا پڑا اور ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ تاکہ وہ "ندوہ کے لئے ایک ایسا نیا دستور العمل بنائے جس سے کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے"

مولانا شبلی نے جلسے کے سلسلے میں کوئی ڈھائی تین مہینے دہلی میں قیام کیا۔ لیکن اس میں انھیں حسب دلخواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ندوہ میں

ان کے حریف ویسے ہی ویسے برسرِ کار رہے اور اصلاحی کمیٹی ان کی زندگی میں کوئی قابلِ ذکر کام نہ کر سکی۔ اس دوران میں نظر کی پھانس کا سامان کثرت سے ملتا رہا۔ جب وہ ندوہ سے علیحدہ ہوئے تو ریاست بھوپال نے ندوہ کی بدانتظامی کی بنا پر اپنی امداد روک لی تھی۔ اس پر صاحبزادہ آفتاب احمد نے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے بقول سید سلیمان ندوی "معاملات کی تحقیقات کے بہانہ سے ایک کمیشن بھیجنے کی تجویز پیش کی۔ جو موجودہ منتظمین کے موافق لیبا معائنہ لکھے۔ جس کو وہ سرکار بھوپال اور گورنمنٹ میں پیش کر کے مسدود امداد کو دوبارہ جاری کر سکیں۔" شبلی کو اس تجویز کا زیادہ رنج تو اس لئے تھا کہ اس کے ذریعے منتظمین کو مسدود امدادیں مل جائیں گی اور ان کے ہاتھ اور مضبوط ہو جائیں گے۔ دوسرے اگرچہ کمیشن کے بھیجنے سے علی گڑھ والوں کا واحد مقصد اربابِ ندوہ کی مدد تھا اور یہ وفد اربابِ ندوہ کے ایما پر بھیجا گیا۔ لیکن شبلی کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ علی گڑھ کانفرنس کے ارکان (اغیار!) ان کے اس ندوۃ العلوم کا معائنہ کریں جسے وہ علیگڑھ کا مدِمقابل، بلکہ کامیاب حریف سمجھتے تھے۔ انھیں اپنے خواب کی یہ تعبیر پریشاں دیکھ کر دلی رنج ہوا اور انھوں نے "ندوۃ العلما اور رنگِ معائنہ اغیار" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم — جو مدعیِ رہبری روزگار ہے
جو مایۂ امید ہے نسلِ جدید کا — جو کاروانِ رفتہ کی اک یادگار ہے
جس پر یہ حسنِ ظن ہے کہ ہے مجمع کرام — جس کا کہ مصر و شام میں اب تک وقار ہے
آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضلِ عرب — جس کا مرقعِ ادبی المنار ہے
چلتے ہیں جس کے نقش قدم پر حریف بھی — گو اعترافِ حق سے ابھی انکو عار ہے

جس نے خطابتِ عربی کو دیا رواج | جو فنِ جرح و نقد کا آموزگار ہے
جس نے بدل دیا روش و شیوۂ قدیم | یہ انقلاب گردش لیل و نہار ہے!
آتے ہیں اُس کی جانچ کو نا آشنائے فن | جو رہبرِ طریقۂ اصلاحِ کار ہے!

ہم اس تحریری عرضداشت کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو علامہ شبلی نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے انگریزی میں لکھوا کر چیف سکریٹری صوبجات متحدہ کے حضور میں پیش کی اور جس میں اپنی وفاداریوں کے ثبوت گنائے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا۔ تو اس کے بعد "احراری" سیاسیات سے کنارہ کش ہو جاتا۔ بہ ظاہر تھا کہ قوم نے جو نیا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس پہ چلنے کی مولانا میں ہمت نہ تھی۔ لیکن شبلی بہ یک وقت مختلف معبودوں کی پرستش میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کے معافی نامہ کا دو تین افراد کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ قوم اس سے یکسر ناواقف تھی۔ وہ ایک ایسی تحریر کو اپنے کاموں اور تحریک حریت کی راہنمائی میں کیوں مخل ہونے دیتے؟

اب اُنھوں نے سیاسیات میں اور بھی بڑھ چڑھ کر قدم مارنا شروع کیا۔ بلکہ علی گڑھ کے طبقۂ احرار پہ بھی چشم نمائی کی ؎

نوا را تلخ تر مے زن، چو ذوقِ نغمہ کم یابی!

۱۹۱۲ء سے اسلامی ہندوستان کے خیالات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا اس سے مولانا شبلی کو خوشی تو بے حد تھی لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی علیگڑھ کے ویران ہو جانے سے شبلی کا ندوہ آباد نہ ہوا بلکہ واقعات ایسے پیش آئے کہ ندوہ بھی شبلی کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس سے طرفہ تر تماشہ یہ پیش آیا کہ حریت و حق طلبی کے میدان میں بھی ندوہ سے وہ لوگ بازی لے گئے۔ جنھیں شبلی کارخانۂ غلامی کی پیداوار کہتے تھے[1]۔ وہ خود ایک خط میں

(فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۲ پر ملاحظہ ہو)

لکھتے ہیں :-

علی گڑھ کے لڑکے اب ہم لوگوں سے بھی آگے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی حالت شوریدگی تک پہنچ گئی ہے۔ آزاد وہاں جائیں۔ تو لوگ ان کی گاڑی کھینچیں۔

اس کے علاوہ میدانِ قیادت میں بھی بالآخر علی گڑھ کا پلّہ بھاری رہا۔ قوم کی نئی سیاسیات میں علی گڑھ کے ترجمان مولانا محمد علی تھے اور شبلی کے نمائندے ان کے شاگردِ رشید، مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی کو بعض امور میں آزاد کے نقشِ قدم پر چلنا پڑا۔ لیکن جو قبولیت اور شہرتِ عامہ انھیں حاصل تھی۔ ابوالکلام کو کبھی نصیب نہیں ہوئی اور قومی قیادت کا سہرا انھیں کے سر بندھا۔ مولانا شبلی کا دل یہ دیکھ کر جلتا تھا کہ نئے میدان میں بھی حریف بازی لے گئے اور وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ جس سے انھیں علی گڑھ کے طبقۂ احرار پر انگشت نمائی کا موقع ملے۔ ہنگامۂ کانپور کے خاتمے نے اس کا بھی سامان کر دیا۔ یہ واقعہ بڑی کشمکش کے بعد اس طرح ختم ہوا تھا کہ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے صوبہ کے گورنر کی رائے کے خلاف مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس پر مسلمانوں میں ان کے لئے بڑا جذبۂ احسان مندی پیدا ہو گیا اور مسلمان راہنماؤں نے، جن میں (سوائے مولانا

(صفحہ ۲۴۱ کا فٹ نوٹ ملاحظہ ہو)

لہ فی الحقیقت اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ علی گڑھ میں اگر وفاداری کی تلقین ہوتی تھی تو اس سے کہیں زیادہ قومی محبت کا سبق ملتا تھا اور وفاداری کی تلقین بھی اسلئے تھی کہ اس میں قومی مصلحتیں پنہاں تھیں۔ بقول نواب وقار الملک وفاداری عرض تھی۔ جوہر نہ تھی۔ یہ پالسی مقصود بالذات نہ تھی۔ بلکہ اس کی بنیاد اور چیز (قومی مصلحت) پر تھی۔

ابوالکلام آزاد گے) ہر طبقہ و خیال کے لوگ شامل تھے اور جن میں مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی شریک تھے۔ والسرائے کی خدمت میں ایک شکریے کا ایڈریس پیش کیا۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے گرم گرم اشعار لکھے تاکہ فریق ثانی کے طبقۂ احرار سے قوم کو بدظن کریں۔ انھوں نے اس موقع پر جو نظمیں لکھیں۔ ان کے دیباچہ میں سید سلیمان ندوی کہتے ہیں:ھ

۲۵ر اپریل ۱۹۱۴ء کو حزب الاحرار کے بعض سرگرم ارکان کی سرکردگی میں والسرائے کی خدمت میں ایک وفد حاضر ہوا اور صلح کانپور کے متعلق شکریہ اور مسلمانوں کی وفاداری کا ایک ایڈریس پیش کیا۔ فرقۂ احرار کی دوسری جماعت کے ارکان نے اس میں شرکت نہیں کی اور اس طریقۂ کار سے اختلاف کیا۔

شبلی کی ایک نظم کا عنوان تھا" تفرقۂ حق و باطل"۔ اس کے بعض اشعار سنیے:۔

احرار اور۔ مدعیانِ وفا ہیں اور
دونوں کا ہے طریقۂ سود و زیاں الگ

دونوں کا منتہائے نظر ہے جو مختلف
ہے خود بخود ہر ایک کا طرزِ بیاں الگ

اس پر بھی صاف صاف نہ تھا امتیاز حق
کھلتا نہ تھا کہ کون الگ ہے؟ کہاں الگ؟

دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا
قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ

اب صاف ہو گیا حق و باطل میں امتیاز
اب فصلِ نو بہار الگ ہے خزاں الگ

اب آفتاب صدق گہن سے نکل گیا
اب شمع دلفروز الگ ہے۔ دھواں الگ

وہ اختلاطِ دُرد و مے صاف اب نہیں
گم گشتگانِ راہ سے ہے کارواں الگ

جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار
کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ

ھ صحیح تاریخ ۲۵ر مارچ ۱۹۱۴ء ہے۔

یہ مختصر فسانہ بزمِ شبینہ ہے
سُنئے گا اہلال میں یہ داستاں الگ!

ایک اور نظم میں اُنھوں نے کہا ہے ؎

سچ تو یہ ہے کہ دِ فاکیشِ ازل ہیں ہم لوگ — ہم کو شکوہ نہیں آئینِ جہانبانی کا
ہم نے یہ لکھ کے جو دی آپ کو تحریرِ وفا — یہ مثنیٰ ہے ہماری خطِ پیشانی کا

شبلی نے شکریے کے ایڈریس کو تحریرِ وفا کہا اور اپنی اس تحریرِ وفا کو بھول گئے جو اُنھوں نے اس سے کوئی دو مہینے پہلے چیف سکریٹری حکومت صوبجات متحدہ کے حضور میں پیش کی تھی۔ لیکن اس موقع پر تو علامہ نے کمال کر دیا۔ یوں تو ان کا تمام عمر دستور العمل یہی تھا کہ ؎

رات کو پی گئے اور صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی!

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کا یہ شعر خاص ان کے لئے لکھا گیا ؎

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است — با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد!!

لیکن اس وقت اُنھوں نے جو کچھ کیا اس کے تصور ہی سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس موقعہ پر انھوں نے پینے اور توبہ کرنے کے لئے شراب خوری اور ادائے نماز کے لئے مختلف اوقات کا انتظار نہیں کیا۔ بلکہ وہ بہ یک وقت بادہ نوشی اور تہجد خوانی میں مشغول تھے! عین اس زمانے میں جب قومی اخباروں میں مولانا شبلی دوسرے ناموں کا بُرقع پہن کر وفد میں شریک ہوتے اور ایڈریس پیش کرنے والوں پر طعن و تشنیع کے تیر چلا رہے تھے اور ان کی غلامانہ ذہنیت کا مذاق اُڑاتے تھے۔ ٹھیک اسی وقت وہ خود اس وفد میں شامل تھے اور تحریرِ وفا پیش کرنے والوں میں پیش پیش تھے!

یکم اپریل ۱۹۱۴ء کے الہلال میں مسلم وفد کے ۴۸ ممبران کی جو فہرست چھپی ہے۔ اس کے شمارہ ۴۹ پر "شمس العلما مولوی شبلی نعمانی" کا نام نامی اور اسم گرامی درج ہے!!

خدا کی شان ہے۔ یہ ان بزرگوں کے کارنامے ہیں۔ جو مذہب کے سرپرست بنتے ہیں۔ جو قوم کے ان محسنوں کو خوشامد اور غلامی کے طعن دیتے ہیں۔ جن کی زندگی کی پاکیزگی اور یک رنگی کی قسم کھانی چاہیے اور طرفہ تر تماشا یہ ہے کہ لوگ فرط عقیدت سے انھیں اسلام کا محافظ اور ترجمان مان لیتے ہیں؎

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

اپنے حریفوں کو زک پہنچانے کے لیے شبلی نے موقع تو اچھا تاکا تھا۔ لیکن کاغذی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔ ان کا افسوں کارگر نہ ہوا اور قوم کی عنان قیادت مولانا محمد علی کے ہاتھ میں ہی رہی!

شبلی کو اگر قوم کی عنانِ قیادت کے اپنے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس تھا۔ تو انھیں اتنا ہی افسوس ملک کی نئی نئی فضا اور قوم کے نئے رنگ کا تھا۔ انھوں نے اس فضا کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا لیکن انھیں یہ خیال نہ تھا کہ قوم میں اس قدر تموّج اور ہیجان پیدا ہو جائے گا۔ وہ الطبع ایک جوشیلے اور جذباتی انسان تھے۔ لیکن نامساعد حالات اور اپنے مقاصد کی خواہش نے انھیں سکھا دیا تھا کہ جذبات کو عقل کے تابع رکھنا چاہیے۔ انھیں قوم کے نوجوان راہنماؤں کا بے نتیجہ جوش و خروش سخت ناپسند تھا اور انھوں نے کئی نجی خطوط میں نئی صورتِ حالات پر رنج و افسوس کا اظہار کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

سخت افسوس ہے کہ ہر حیثیت سے زمانہ میں خربازاری بڑھ گئی ہے۔ نیک و بد کی تمیز مطلق نہیں۔ ابھی آغا خاں۔ علی محمدؐ خاں۔ محمدؐ علی کو آسمان پر چڑھایا۔ ابھی اوپر سے زمین پر دے مارا۔ اپنی گرہ کی عقل نہیں مسلم گزٹ کی ہر تحریر کو ایک لونڈا پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ معاندانہ اور یک طرفہ ہے لیکن سینکڑوں احمق اس کی حریت کے قائل ہیں۔

اس زمانے میں مسلم لیگ کے سکریٹری مسٹر (حال سر) وزیر حسن اور لیگ کی شاخ لندن کے صدر سید امیر علی کے درمیان مسجد کانپور' بلکہ لیگ کے عام انتظامی معاملات کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا۔ مولانا محمدؐ علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے تمام نوجوان احرار نے وزیر حسن صاحب کا ساتھ دیا۔ صرف شبلی ہی طبقۂ احرار کے ایک فرد تھے جنھیں قوم کے ایک دیرینہ اور پختہ کار خادم' سید امیر علی کے ساتھ نوجوانوں کی یہ کم نگہی گراں گزری ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

پولٹیکل معاملات میں جو طوائف الملوکی پیدا ہو گئی ہے سخت قابلِ نفرت ہے۔ وزیر حسن اور امیر علی کا کیا مقابلہ ہے؟ قوم حقیقت میں سر سید مرحوم کے وقت بھی اندھی تھی۔ اور اب بھی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال ایک لحاظ سے شبلی کے خیالات کا آئینہ اور ان کی دلی خواہشات کی تکمیل کا موثر ذریعہ تھا۔ لیکن بالآخر الہلال نے جو رنگ اختیار کیا اور مخالفوں کی تضحیک کے لئے جو طریقے استعمال کئے۔ شبلی ان سے بالکل کنارہ کش تھے اور انھوں نے علانیہ ایک نظم میں' جس کا عنوان تھا۔ مدوجزر۔ الہلال کا لب و لہجہ۔ اس پر نکتہ چینی کی اس نظم کے چند شعر ہیں ؎

دیکھ کر حرّیتِ فکر کا یہ دورِ جدید ۔۔۔ سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے، کہ نہیں؟
راہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام ۔۔۔ اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟
شاطروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط ۔۔۔ اس میں ان پر بھی کہیں کوئی زد ہے کہ نہیں؟
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری! ۔۔۔ اس دور راہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں؟

لیکن شبلی کو زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ قومی معاملات نے جو رنگ اختیار کیا۔ اس کی وجہ سے قوم کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ شبلی میں ایک طرز کی انانیت کی کمی نہ تھی۔ انھیں اپنی ذات سے محبت تھی۔ اپنے ندوہ سے محبت تھی۔ اپنے خیالات سے اُنس تھا۔ لیکن اس مجموعۂ اضداد کو سب سے زیادہ محبت، سب سے زیادہ اُنس، سب سے زیادہ لگاؤ اسلام اور اپنی قوم سے تھا اور جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے اپنے خیالات کی اشاعت و مقبولیت کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ قوم کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو انھوں نے نئی صورت حالات پر رنج و کرب کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ پہلے شبلی نے شخصی خطوط میں قوم کی نئی لامرکزیت پر آنسو بہائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشاں خیال اور پریشاں عمل ہو رہے ہیں۔ کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے ورنہ ہر طرف سے بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے" اور جب یہ نجی تحریریں کارگر نہ ہوئیں۔ تو انھوں نے اخبارات میں اشعار کے ذریعے اپنا دردِ دل بیان کیا۔ ان کی اخیر عمر کی ایک نظم ہے۔ "خطاب بہ احرار۔ ایک مرکز کی ضرورت" اس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

بتکدے آپ نے ڈھائے، بہت اچھا، لیکن ۔۔۔ شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھے بنیاد
آبلہ قابلِ نشتر تھا، یہ مانا، لیکن ۔۔۔ دیکھیے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد

آپ کہتے ہیں، کہ وہ مجمع ناجائز تھا — خیر جو کچھ تھا، مگر جمع تو سے کچھ آزاد
اب کوئی مرکزِ قومی ہے، نہ توحیدِ خیال! — نہ کوئی جادۂ مقصد ہے، نہ کچھ توشۂ زاد!

خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم!
خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد!
ذرّے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اُڑ اُڑ کے فنا
یوں ہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد!

انسانی تجویزوں اور منصوبوں کا عجیب حال ہے۔ ذہنِ انسانی کے اندر تو ان کا کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ تخیل کے حجروں سے نکل کر عمل کی دنیا میں آتے ہیں۔ تو بعض اوقات ایسی عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں کہ خود انھیں سوچنے والا حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔
شبلی نے کیا سوچا تھا اور ہو کیا گیا!!

———— ٭ ————

وفات

ندوۃ العلما کی بساط پر شبلی نے بری طرح مات کھائی تھی اور قومی قیادت کی مجلس میں بھی انھیں بالآخر رنج و مایوسی کا تلخ جام پینا پڑا۔ اس وقت ان کی صحت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک "متحرک لاش" کہتے تھے۔ اور کوئی ہوتا تو ہمت ہار دیتا۔ اور قومی کاموں سے دست بردار ہوجاتا۔ لیکن مولانا میں بلا کا استقلال اور حوصلہ تھا۔ انھوں نے اپنی تمام عمر کے ارمانوں کو خاک میں دفن ہوتے دیکھا۔ انھیں رنج تو بے حد و بیرون از قیاس ہوا ہوگا۔ لیکن انھوں نے دل پر پتھر رکھا اور دہلی کے جلسہ سے بے نیل مرام رخصت ہونے کے فوراً بعد سید سلیمان ندوی کو لکھا۔

> ندوہ تو سرِ دست گیا۔ اب کیا کرنا چاہئے؟ آزاد سے مشورہ ہوا۔ رائے یہ ٹھہری کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے۔ اس لئے میں خود دو چار قابل طلبا کو اپنے پاس رکھوں اور ان کو کسی کسی فن میں تیار کروں اور صحیح مذاق ان میں پیدا کرایا جائے۔ ان کے مصارف کا تکفل بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہوگا۔

مولانا نے اس زمانے میں دارالمصنفین جاری کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا اور الہلال میں اپنی تجویز ملک کے سامنے پیش کردی تھی۔ اب انھیں ہر طرف سے بھٹک کر نظر آگیا تھا کہ وہ سب سے پہلے ایک مصنف ہیں۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ انتہائی علم و فضل اور مذہب سے کمال محبت کے

باوجود ان کی شخصیت میں حسنِ سیرت کے ایک دو خانے اس طرح خالی تھے کہ ان کے لئے علما کی محفل میں میر مجلس ہونا ناممکن تھا۔ قومی قیادت کے میدان میں بھی اب معاملہ خوشنما تجاویز اور محض لبرل خیالات سے بہت آگے نکل چکا تھا اور اس میدان میں وہ نوجوانوں کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی ایک مملکت ایسی تھی جس میں ان کا سکہ چلتا تھا اور ایک محفل اس طرح کی تھی جس کی صدارت کے لئے ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ یہ مملکت علم وادب کی مملکت اور یہ محفل ادبا واہلِ علم کی محفل تھی۔ اب شبلی کو ان چیزوں کی قدرومنزلت معلوم ہوئی اور انھوں نے اندازہ لگایا کہ اگرچہ بڑے ادارے چلانے ان کے بس میں نہیں۔ لیکن اپنے قلم کی مدد سے ہی وہ ایسا اثر حاصل کرسکتے ہیں۔ جو بڑے بڑے مدرسوں اور عالیشان اداروں کو بھی میّسر نہیں۔ وہ نومبر ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

ہندوستان میں اور ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے۔ اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے۔ ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔

جلسۂ دہلی کے بعد مولانا بمبئی میں سیرت النبی کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ساتھ احباب سے یہ مشورہ کررہے تھے کہ دارالمصنفین کو کس جگہ قائم کیا جائے۔ علی گڑھ میں؟ لکھنؤ میں؟ یا اعظم گڑھ میں؟ کہ اس سوال کا حل خود قضا وقدر نے کر دیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے بھائی مولوی محمد اسحاق نے وفات پائی۔ اور اب وہ مجبور ہو گئے کہ سب طرف سے آنکھیں بند کرکے اعظم گڑھ کا رُخ کریں۔ اس بھائی کی وفات نے ان پر بڑا اثر کیا۔ ایک تو وہ خود ان دنوں غموں، مایوسیوں اور جسمانی کمزوری سے

نڈھال تھے۔ دوسرے اسحٰق مرحوم نے انھیں سب خاندانی ذمہ داریوں سے آزاد کر رکھا تھا۔ بھائی کی وفات نے مولانا کی کمر توڑ دی اور انھوں نے "بربادیٔ خانماں شبلی" کے عنوان سے اس کا ایک دل ہلا دینے والا مرثیہ لکھا ؎

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا — وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیٔ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا — قوتِ دست و دلِ شبلیٔ نعمانی تھا
جوش اسی کا تھا جو بیرسرِ پُرشور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پُرزور میں تھا

جب کیا والدِ مرحوم نے دُنیا سے سفر — گھر کا گھر تھا ہدفِ ناوکِ صد گونہ خطر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر — تیر جو آئے گیا آپ وہ ان کی زد پر
خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں
اس نے غم اسلئے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم — گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج و الم
امن و راحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم — میں تھا اور مشغلۂ نامہ و قرطاس و قلم
اسکے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنوں تھا مرا گوشۂ تنہائی بھی!

بھائی کی وفات نے مولانا کا دل بٹھا دیا۔ لیکن یہ ہمت اور استقلال کا پہاڑ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہ مولانا شروانی کو یہ لکھ کر کہ "عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر نہیں ہوا تھا۔" انھیں اپنے منصوبہ ارادوں کی اطلاع دیتے ہیں۔ ایک کام تو محمدن شبلی سکول کا چلانا تھا جسے انھوں نے اعظم گڑھ میں ۱۸۸۳ء میں قائم کیا تھا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

مجھ کو اس کام کے علاوہ دار المصنفین اور دار التکمیل کی فکر ہے۔ ندوہ میں کام کرنا

ممکن نہ تھا۔ ۶ برس تک کشاکش میں گزرے۔ جو ہو گیا وہ تعجب انگیز ہے بہرحال صورت موجودیہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے۔ جس کا کل رقبہ گیارہ بیگھ پختہ ہے۔ اس کو وقف کر رہا ہوں اور شرکا بھی راضی ہو گئے ہیں۔ مسودہ لکھا جا چکا۔ رجسٹری کرانا ہے۔ دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا۔ بلکہ صرف کتب خانہ کے لئے کافی ہوگا۔ دارالمصنفین کی عمارت کے لئے کچھ اضافہ ہوگا۔

شبلی کو بھائی کی وفات کا دلی صدمہ تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ پہنچ کر اور کام شروع کر کے انھیں ایک طرح کا سکون آ گیا۔ ان کے آخری دو سال، بلکہ قیامِ ندوہ کے آخری پانچ سال بڑی کشمکش اور کرب و بے چینی میں گزرے تھے۔ ان ہنگاموں سے نکل کر وہ اعظم گڑھ کی عزلت گاہ میں آئے۔ تو طبیعت کو بالکل ایک نیا قرار محسوس ہوا۔ بلکہ ان کی زخم خوردہ انانیت، کی تسکین کے لئے ایسی سہولتیں میسر آئیں کہ دل میں فرحت و مسرت کے جذبات اُبلنے لگے۔ مولوی مسعود علی ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

> میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے۔ تعلیمی کام شروع ہو گئے ہیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے۔
>
> باغ ہے۔ بنگلہ ہے۔ حکومت ہے۔ گریجویٹ ہیں۔ اسکول ہے۔ تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب دلخواہ کام کرتے ہیں۔ نہ کہ وہاں سگانِ بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا۔

شبلی کو تمام عمر اعظم گڑھ ناپسند رہا۔ علی گڑھ سے ایک سال کی رخصت لے کر یہاں آئے۔ تو قطعی دل نہ لگا اور اس زمانے کے کئی خطوں میں کہتے ہیں کہ اعظم گڑھ میں ہرگز بسر نہیں کر سکتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "اعظم گڑھ میری قسمت میں نہیں ہے۔ اور اب مجھ کو وہ لگاؤ بھی نہیں رہا" انھیں اپنے دنیادار والد سے بھی کئی شکایتیں تھیں۔ لیکن خدا کی شان ہے کہ مخالفت کے اس طوفان میں، جو اخیر عمر میں شبلی کے خلاف برپا ہوا۔ ان کی آخری جائے پناہ ان کے باپ کا باغ اور بنگلہ تھا۔ اور وہ اعظم گڑھ جسے شبلی تمام عمر اپنی تجویزوں کے لحاظ سے نہایت حقیر سمجھتے رہے۔ ان تجویزوں کی تکمیل کا سب سے موزوں گہوارہ ثابت ہوا!

اعظم گڑھ پہنچ کر شبلی کی طبیعت میں تسکین آ گئی۔ لیکن اب ان کے خطوں سے ایک قسم کی تکان اور پژمردگی ٹپکتی ہے۔ فیضی زہرا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

مکرمۂ من! آہ کیا لکھوں۔ میں اب کسی کام کا نہیں رہا۔ برادر مرحوم کی وجہ سے میں آزاد پھرتا تھا اور جہاں چاہے رہتا تھا۔ اب وطن سے نکلنا محال سا ہو گیا ہے۔ مرحوم گھر بھر کا چراغ تھا اور سب کاروبار اس کی بدولت چلتا تھا۔

اس حالت میں بھی عطیہ کی یاد دل کی گہرائیوں میں اسی طرح جلوہ فگن تھی۔ جس طرح اندھیری رات میں ایک جگنو ٹمٹماتا ہے۔ اسی خط میں آگے چل کر، حریم دوست کے پاسبان سے کہتے ہیں:۔

عطیہ اگر آجائیں تو بہت سلام شوق کہئے۔ اور کہئے۔ کہ کاش وہ میرے گھر آ کر تعزیت کرتیں کہ دل کو تسکین ہو سکتی"

اس کے علاوہ ان پر مخالفوں کے تیر بھی چل رہے تھے۔ ملک کو اپنی نئی تصنیف سے روشناس کرنے، اور سیرت النبی کا اندازِ تحریر دکھانے کی خاطر انھوں نے الہلال

میں سیرت النبی کا مقدمہ شائع کیا تھا۔ مولوی عبد الشکور صاحب ایڈیٹر النجم نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مقدمہ پر نہایت سخت تنقید لکھی۔ مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔ اس تنقید کو دستاویز بنا لیا۔ اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا۔"

مولانا کی صحت بھی اب بالکل جواب دے رہی تھی اور انھیں نظر آرہا تھا۔ کہ یہ کام ان سے ختم نہ ہوگا۔ سیرت کی ناتمامی ان کے دل پر ایک سخت رنج و داغ تھا۔ مولوی حمید الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

سیرت پوری نہ ہو سکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے۔

افسوس کہ یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی شبلی سے سیرت پوری نہ ہوئی اور اگرچہ ان کی وفات کے بعد سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقائے کار نے کتاب کو مکمل کر دیا لیکن جس انداز اور معیار پر شبلی نے کتاب لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ نظر انداز ہو گیا۔

اخیر عمر میں شبلی کو سیرت سے بے حد شغف ہو گیا تھا۔ اب سیرت ان کے لئے ایک ڈھال بھی تھی اور ایک شمشیر خارا شگاف بھی۔ جب مخالف ان پر طرح طرح کے الزام لگاتے تو وہ حضور رسالت مآب کی بارگاہ میں پہنچ کر، اور سیرت میں مشغول ہو کر دشمنوں کے حملوں اور مناقشات سے پناہ لیتے۔ سیرت ان کی اسکیموں کی کامیابیوں کا ذریعہ بھی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مولوی محمد امین زبیری کی مدد سے بھوپال کے ماہوار دو سو روپئے "سیرت" سے دار المصنفین کو منتقل کرائے اور اپنی تجویزوں کے نئے مرکز کو شروع سے ہی وہ مالی امداد بہم پہنچا دی۔ جو ندوہ کو دس بارہ سال کی مدت حیات کے بعد بھی حاصل نہ ہوئی تھی۔

سیرت کی ناتمامی کے داغ کے علاوہ شبلی کو اپنی عمر کے آخری ایک دو مہینوں

میں ایک اور چرکا لگا۔ یورپ کی پہلی جنگِ عظیم اگست ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی اور نومبر میں ترکی بھی برطانیہ کے خلاف میدان میں آ گیا۔ اس وقت ترکی کے اس سچے شیدائی کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہوگی۔ اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں لیکن بےبس تھے۔ شبلی کے جذبات شعر بن کر اُبلتے ہوں گے۔ لیکن لہو کے گھونٹ پی کر خاموش ہونا پڑتا تھا۔ وہ ان دنوں بیمار بلکہ بسترِ مرگ پر دراز تھے کہ انھیں ایک خاص طور پر رنجیدہ صورتِ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :۔

> نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکوں نے بھی لڑائی میں جرمنوں کے ساتھ ہو کر انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ ہر شہر کے پرانے وفادار مسلمانوں کی طرح اعظم گڑھ کے چند وفاداروں نے بھی ترکوں سے برأت کا اعلان مناسب سمجھا اور اس کے لئے قیامت یہ کی کہ خود شبلی منزل کو جلسہ کا مقام بنایا جس کی مولانا کو خبر نہ تھی۔ عین وقت پر جب وہ دوسرے کمرے میں موت کے بستر پر پڑے تھے۔ ان کے بچپن کے ایک بے تکلف دوست ان کے پاس گئے۔ "کہ آپ رضامندی دیں تو جلسہ آپ کی صدارت میں ہو" مولانا یہ سن کر بے چین ہو گئے۔ ان کی طرف منہ کر کے فرمایا۔
> "بھائی صاحب میں تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ترک اپنی جوتیوں میں میری کھال کا تسمہ بھی لگائیں"

مولانا نے جلسے کی صدارت نہیں کی لیکن اخبارات میں اعلان ہوا۔ حکام کو اطلاع دی گئی کہ اعظم گڑھ کے مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ برطانوی حکومت سے وفاداری اور ترکوں سے علیحدگی کا اظہار کرنے کے لئے شبلی منزل میں منعقد ہوا۔

علامہ شبلی شدید علالت کی وجہ سے جلسے کی صدارت نہیں کر سکے۔ لیکن شہر کے دوسرے معززین جمع تھے۔ اور باتفاق رائے سے ترکوں سے علیحدگی کا رزولیوشن منظور ہوا !!

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے۔ ترکوں سے اختلاف کے اظہار کے لئے ترکوں کے سب سے بڑے محب کا گھر منتخب کیا جاتا ہے۔ مولانا اس وقت مکان پر موجود ہیں۔ جس کمرے میں جلسہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں لیکن اتنی سکت نہیں کہ جلسے کو روک سکیں !!

شبلی کی صحت دو چار سال سے بہت خراب رہنے لگی تھی۔ ان کا قلب ایک عرصے سے کمزور تھا اور معدے کی حالت اس سے بدتر تھی۔ اخیر عمر میں اسہال کے دورے جلد جلد پڑنے لگے اور ضعف بہت بڑھ گیا۔ نومبر ۱۹۱۳ء میں انھوں نے افیون کھانی شروع کر دی تھی لیکن اس سے فقط عارضی افاقہ ہوا۔ اس کے قریباً ایک سال بعد، نومبر ۱۹۱۴ء کو وہ عید اضحیٰ کی تقریب میں بندول تشریف لے گئے۔ دوسرے دن پلٹ کر واپس آئے۔ تو اپنے قدیمی مرض اسہال اور ہیضہ میں مبتلا تھے۔ تین روز تک انگریزی ڈاکٹر کا علاج رہا۔ لیکن اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ چوتھے روز یونانی طبیب کو بلایا گیا۔ اس کی دوا سے حالت اور بگڑ گئی۔ ایک دن میں ۵۰۔۶۰ دست آئے اور خون بھی بہت آیا۔ اس سے ضعف کی شدت بڑھ گئی۔

مولانا کو اس حالت میں بھی سیرت کا خیال سب سے پہلے تھا۔ جب ان کی علالت کا ابھی آغاز تھا۔ تو انھوں نے سیرۃ نبوی کے تمام مسودے مبیضے بستے میں بندھوا کر الماری میں مقفل کروا دئے تھے۔ جب حالت نازک ہو گئی۔ تو انھوں نے اپنے تین مخصوص تلامذہ اور رفقائے کار، مولانا

ابوالکلام آزاد۔ مولوی حمیدالدین۔ سید سلیمان کو فرداً فرداً تار بھجوائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تار کا مضمون تھا۔

اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبویؐ کی سکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا۔ ورنہ سب کیا کرایا بیکار ہو جائے گا۔ سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلین سمجھا دیا جاتا۔

پتہ نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ تار ملا یا نہیں۔ کیونکہ ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن سید سلیمان کسی تار کے ملے بغیر فقط دل کی کشش سے اعظم گڑھ روانہ ہو گئے اور ۱۵ر نومبر کی شام کو وہاں جا پہنچے۔ جس وقت شاگرد اُستاد کے پلنگ کے قریب گیا تو طاقت جواب دے چکی تھی۔ شاگرد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ علامہ نے آنکھیں کھول کر حسرت سے سلیمان کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا؟ پھر زبان سے بھی فرمایا۔ "اب کیا" "اب کیا"۔ لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلایا۔ تو جسم میں یک بار طاقت محسوس ہوئی اس وقت علامہ نے معاہدہ کے طور پر سلیمان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کرو"۔ سلیمان نے بھرائی ہوئی آواز میں وعدہ کیا۔ "ضرور۔ ضرور"[1]

اگلے روز شام کو مولانا حمیدالدین بھی آ گئے۔ پھر انھیں اور سلیمان کو بلا کر کہا "سیرت سیرت" اور اُنگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا "سب کام چھوڑ کے"۔

---

[1] حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی۔

مولانا کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ طبی علاج و اہتمام جاری تھا۔ لیکن اب مولانا نے دوا کے استعمال سے انکار کر دیا اور آخری تین روز کوئی دوا نہیں پی۔ سترہ کی شام کو ڈاکٹر محمد نعیم جو انصاری وفد میں شریک تھے۔ آئے تو اُنھوں نے تمام اعضا کا معائنہ کر کے کہا۔ "دماغ کے سوا باقی تمام اعضا معطل ہو چکے ہیں۔ اب تدبیر بے سود ہے" اس کے کوئی بارہ گھنٹے بعد شبلی نے آخری سانس لیا اور ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو چہار شنبہ کے دن صبح کے ساڑھے آٹھ بجے دنیا کو الوداع کہا۔

شبلی کی وفات پر علمی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ دوستوں۔ شاگردوں۔ اور عقیدتمندوں نے مرثیے اور تاریخیں لکھیں۔ عزیز لکھنوی کا قطعۂ تاریخ تھا ؎

آہ سر دفترِ اربابِ کمال — کہ ز دفتر کدۂ فانی رفت
حاکمِ محکمۂ علم و حِکم — ناظمِ ملکِ سخن دانی رفت
فاضل و افضل و بے مثل نماند — کامل و اکمل و لاثانی رفت
باکمالے کہ تو آگاہی از و — ہمہ دانے کہ تو مے دانی رفت
بر دل و جانِ من از رفتنِ او — رنجِ روحانی و جسمانی رفت

خاستم چوں از سرِ جاں ہاتف گفت
مولوی شبلیٔ نعمانی رفت

۱۳۳۵ھ

سید سلیمان نے لوحِ مزار کے لئے تاریخ لکھی۔ جو شاعرانہ اور ادبی نقطۂ نظر سے بیش قیمت نہ سہی۔ لیکن لکھنے والے کے حسنِ عقیدت کا پتہ دیتی ہے ؎

سعدیِ عصر و غزالیِ زمان، خلدونِ وقت — شبلیِ نعمانی والا گہر عالی سرشت

سیزدہ صد بود ودوی ددد روز پنجبیں   بست وہشت ماہ ذی حج کہ این منزل ہشت

شبلی کی وفات پر عطیہ بیگم صاحبہ کی خاندانی ڈائری میں جو اندراج ہوا شاید وہ بھی کسی قدر دلچسپی سے پڑھا جائے۔ یہ اندراج جو وفات کے کوئی دو مہینے بعد لکھا گیا۔ حسب ذیل تھا۔

وفات مولانا شبلی نعمانی   نومبر ۱۹۱۴ء

وفات مولانا الطاف حسین صاحب حالی   دسمبر ۱۹۱۴ء

یہ کیسے مشاہیر ہند چلے گئے اور مولانا (شبلی) صاحب تو کیسے ہمارے دوست تھے اور ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ

یادگارِ زمانہ ہیں ہم   سُن رکھو فسانہ ہیں ہم

مولانا شبلی اولاد کے معاملے میں خوش قسمت نہ تھے۔ ان کے بہت سے بچے صغر سنی میں وفات پا گئے۔ دو بیٹیاں جو جوان ہوئیں۔ وہ بھی صاحبِ اولاد ہو کر ان کی زندگی میں ہی چل بسیں۔ مولانا کی وفات کے وقت فقط حامد حسن نعمانی زندہ تھے۔ لیکن مولانا کی اصل اولاد سلیمان، مسعود علی ندوی اور عبدالباری تھے۔ جو ان کے علمی وارث بنے اور جن سے زیادہ سعادتمند اولاد کسی خوش نصیب باپ کے حصّے میں نہ آئی ہوگی۔

مولانا کے آخری سال بڑی مایوسیوں اور ناکامیوں کے تھے۔ لیکن یہ مایوسیاں عارضی اور یہ ناکامیاں ظاہری تھیں۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے انھیں اس امر کا اندازہ ہو گیا تھا کہ خواہ وہ علما کے "شیخ الکل" یا پولٹیکل مجلس کے صدر نشین ہونے کے اہل نہ ہوں لیکن وہ ایک کامیاب شاعر اور کامل الفن ادیب تھے۔ اور "ایک کامیاب مصنف لاکھوں دلوں پر حکمرانی کرتا ہے"! انھوں نے اس زمانے میں ایک تصنیفی انجمن کا کام

شروع کیا اور ان کی وفات کے چند ماہ بعد دارالمصنفین کا باقاعدہ آغاز
ہوا۔ جس نے شبلی کے خیالات کی اشاعت اور ان کے ارادوں کی تکمیل میں
ندوہ سے بھی بڑھ کر کام کیا ہے۔ ندوے کی بساط پر شبلی نے بازی ہاری
تھی لیکن آج شبلی کے ندوی حریفوں کو کون جانتا ہے؟ مسلم گزٹ کے
جن پرچوں میں ان کے خلاف اعتراضات اور الزامات چھپے تھے انھیں
سخت تلاش کے بعد بھی حاصل کرنا دشوار ہے لیکن شبلی کے قلم کی ایک ایک
سطر موجود ہے اور اردو ادب کا جزو بنتی جاتی ہے۔

شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دل و
دماغ پر ان کا سکہ برابر جاری ہے۔

ضمیمہ

مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی

"مولانا شبلی کی جب ہم سے پہلی ملاقات ہوئی ہے تو ہمارے درمیان کوئی حیثیت آ نہ تھی۔ وہ ۱۸۹۲ء میں جب استنبول گئے تھے تو میرے والد مرحوم حسن آفندی صاحب نے جو بارگاہِ سلطانی میں کافی رسوخ اور ارکانِ سلطنت پر بہت کچھ اثر رکھتے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڑھ کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے خاص علقوں میں ان کا تعارف بھی کرایا گیا۔

ایک مدت بعد والد مرحوم کا انتقال ہوگیا اور ہمارے خاندان کا مستقل قیام بمبئی ہی میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہم بہنوں کو لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ یہاں شیخ مشیر حسین قدوائی بار ایٹ لاء و تعلقہ دار گدیہ کے دولت خانہ پر مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی جن کی علمی شہرت ہم سن چکے تھے ہم بہنیں ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں۔ اس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے ہم سب نے بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا اور جب واپس ہوئے تو سلسلہ خط و کتابت جاری ہوگیا۔

دوسرے سال ان کے پاؤں میں گولی لگنے کے بعد وہ مصنوعی پاؤں کے انتظام کے لئے بمبئی آئے اور پھر تو بار ہا آئے۔ ہم سب سے بے تکلفانہ ملاقاتیں رہیں۔ کبھی کبھی ان ملاقاتوں میں ہمارے خاندان کی اور بیگمات بھی شریک ہوتی

تھیں۔ علمی۔ قومی۔ سیاسی باتیں ہوتی تھیں اور سب ہی عورتیں اور مرد ان کی عزت کرتے تھے۔ جنجیرہ میں بھی ان کو مدعو کیا گیا اور ان کے ندوہ کو بھی اخلاقی و مالی مدد دی گئی۔

ان ملاقاتوں میں اب وہ پہلے سے مولانا نہ تھے۔ نہایت آزاد خیال، عورتوں کی سوسائٹی میں بے تکلف شرکت کرتے تھے۔ رسمی و رواجی پردے کے علمی و عملی طور پر مخالف تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے شعر و شاعری اور مہذب لطائف و ظرائف اور خیالات کی یکسانی سے یہ ملاقاتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔

غرض ان کی زندگی بھر یہ سلسلہ قائم رہا ان کے انتقال کا ہم سب کو عزیزوں کی طرح رنج ہوا ہم نے ان کے خطوط کو جو اس وقت موجود تھے بڑی حفاظت سے رکھا۔ کیونکہ ان خطوں میں بھی ایسی ہی باتیں تھیں۔

سنہ ۲۲-۱۹۲۳ء میں اڈیٹر ظل السلطان محمد امین صاحب زبیری جن سے بھوپال کے توسل سے ہماری ملاقات تھی اور جو مولانا کے بھی بڑے مداح اور دوست تھے بمبئی آئے اور ان سے مولانا کا تذکرہ آیا تو میں نے ان کو وہ خطوط دکھائے اور ان کی درخواست پر ظل السلطان میں اشاعت کی اجازت بھی دے دی اور پھر یہ مجموعہ شائع ہوا۔ اس واقعہ کو سالہا سال ہو گئے مگر اب تھوڑا عرصہ ہوا جب میرے علم میں آیا کہ اسی زمانہ میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوں کا ایک مجموعہ مکاتیب شبلی کے نام سے شائع کیا تھا اور اس میں بعض خطوط ایسے بھی شائع کئے جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات و شخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان خطوں سے

دیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آگیا ہے۔ ریڈیو پر تقریریں ہوئی اور اکثر دو رسائل میں مضامین شائع کئے گئے۔ اگرچہ ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی۔ البتہ مکاتیب شبلی کے خطوں کے ساتھ پڑھنے سے بے شک یہ مواد ملتا ہے مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں۔ جہاں بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کو ایسے رازدار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ جو مہذب تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں اور یہ بزرگ ان خطوں کو اشاعت کے لئے نذر کر دیتے ہیں اور ان کے جانشین بھی جو علم و اخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں ان کو شائع کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس طرح وہ لائبل کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ کیا اسی معیارِ شرافت پر ان عالموں اور فاضلوں کو ناز ہے؟ ان کو اپنے دِل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہیے تھا کہ اگر ان کے خاندان کی خواتین اس پوزیشن میں ہوتیں تو وہ ایسے خطوط کی اشاعت گوارا کرتے؟ انھوں نے یہ بھی غور کیا ہوتا کہ خود مولانا شبلی کے اخلاق کے متعلق دُنیا کیا رائے قائم کرے گی۔

ہم نے مولانا کے خطوں کو جو ہمارے نام آتے تھے۔ ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا۔ کیونکہ ان میں بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی قسم کی بدگمانی کرتا یا کسی بُرائی کا احساس ہوتا۔ البتہ بعض میں شوخی ضرور رہوتی تھی۔ جو شاعرانہ طبیعت کا خاصہ ہے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رازو اشارات اُن ہی جذبات پر مبنی تھے اور بعض نظموں میں بھی

ان کو بھی شاعری کے پردے پر ظاہر کرتے تھے۔

میں محمد امین صاحب زبیری کی شکرگزار ہوں کہ اُنھوں نے ہماری پوزیشن کو تبصرہ حیاتِ شبلی میں بیان کرکے صاف کر دیا اور دنیا کو اصل حقیقت بتادی۔ واقعی سعدی کا یہ قطعہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ:۔

"انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس کی خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اور ہم بھی اسی علم و لاعلمی میں رہے۔"

عطیہ بیگم

(ادبی دنیا۔ ماہ جولائی۔ اگست ۱۹۳۶ء)